بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلخیص محاضرات سیرت

رضا تیمور

﴿۲﴾

Summary of "Muhaadaraat-e-Seerat"

This work is a precise summary of the book "Muhaadarat-e-Seerat" authored by Dr. Mahmood Ahmad Ghazi (1950-2010), which deals with Seerah-Sciences ('Ulûm-e-Sîrat), not with Seerah itself. The 768 pages book portrays a thought provoking understanding of the discipline of Seerah; its evolution of Seerah-writing; suggests new methods of Seerah-writing within the disciplines of contemporary social sciences i.e. Sociology, Psychology, Political Science, Economics, History, Geography and Theology. The book has been produced on the bases of the lectures delivered by the learned scholar of 20th century. An attempt has been made to highlight the major themes of in this summarised treatise.

باب ہفتم: ریاست مدینہ۔ معاشرت و معیشت

اس بحث میں جو پچھلی بحث کا تتمہ ہے، دو چیزوں کا احاطہ کیا جائے گا۔ مدینہ منورہ کی معاشرت اور

اس سے متعلق چند مسائل، ریاست مدینہ کے وہ انتظامی شعبے جن کا تعلق معیشت سے ہے۔ اول الذکر بحث مدینے کے جغرافیائی خدوخال کے بیان کے متقاضی ہے، لہٰذا سب سے پہلے اسی کی تفصیلات کو رقم کیا جائے گا، تاکہ مدینے کی معاشرت کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مدینہ اور مکہ حجاز میں واقع ہے، حجاز عرب کے ایک مغربی سلسلے جبل السرہ کے وسطی حصے کو کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بحیرہ احمر کے متوازی یمن سے مدائن تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے اور سمندر کے درمیان ساحلی پٹی کو تہامہ کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ علاقہ صحرا اور سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل ہے، جس میں کہیں کہیں نخلستان پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا نخلستان مدینہ تھا، اس کے اردگرد لاوے کی چٹانیں تھیں جن سے قدیم زمانے میں لاوا نکلتا رہا تھا۔ ہجرت سے کچھ عرصے قبل بھی لاوے کی چٹانیں پھٹی تھیں۔ ان چٹانوں کی اہمیت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے مابین جگہ کو بیت اللہ کے قرب وجوار کی طرح حرام کی حدود قرار دیا۔ (۱۰۹) علامہ سمہودی نے وفاالوفا میں اس لاوے کے بارے میں بہت سی معلومات یک جا کی ہیں۔ اس لاوے نے مدینے کی زرخیزی میں اضافہ کر دیا، جس سے وہاں کی پیداوار بہت بڑھ گئی۔

عرب کے باشندوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اہل المدر جس کے لغوی معنی اینٹوں والوں کے ہیں۔ مراد وہ لوگ جو پختہ مکانوں میں تمدنی زندگی گزرتے تھے۔ مکہ، طائف، مدینہ، خیبر وغیرہ کے لوگ اس شمار میں آتے تھے۔ آبادی کے دوسرے بڑے حصے کو اہل الوبر کہا جاتا تھا، جس کے معنی اون والوں کے ہیں۔ اس سے مراد اونٹ کی اون ہے، جس کے خیمے بنتے تھے۔ لہٰذا یہ خانہ بدوش لوگ تھے جو خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے اور پانی وخوراک کی فراہمی کی نسبت سے سفر کرتے رہتے تھے۔ ان کی بھی مزید دو اقسام تھیں۔ ایک وہ ایک متعین علاقے میں ہی حرکت کرتے تھے، جب کہ دوسری قسم کے لوگ پورے جزیرہ عرب میں پھرتے تھے اور شام وعراق بھی چلے جایا کرتے تھے۔ مدینے میں اگر خانہ بدوشی کی نشان دہی کی جاسکتی ہے تو وہ پہلی قسم کے لوگ تھے جو مدینے میں ہی اپنی زمینیں بیچ کر دوسری جگہ بہتر زمین خرید کر اس پر آباد ہو جاتے تھے۔ اس سے پورے کا پورا قبیلہ یا اس کی ذیلی شاخ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی تھی۔

مدینے کی لمبائی بارہ سے چودہ میل اور چوڑائی آٹھ سے دس میل تک ہے۔ لمبائی کے رخ ایک طرف جبل عیر ہے جہاں آج کل مدینے کا ائرپورٹ ہے، جب کہ دوسری طرف جبل احد ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی بستیوں کا مجموعہ تھا جن کی تعداد اٹھائیس بتائی جاتی ہے۔ ہر بستی میں چھوٹے چھوٹے قلعے موجود تھے

جنہیں آطام کہا جاتا تھا۔ آطام کے حوالے سے مدینہ ۵۵ سے لے کر ۷۸ بستیوں کا مجموعہ تھا۔ ان میں سے بعض کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں جن میں مشہور کعب بن اشرف یہودی کا آطام ہے جو مسجد نبوی سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ہے۔ کعب بن اشرف کی حیثیت کے حوالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان آطام کی نوعیت کیا تھی۔ یہ نہ صرف آبادی کا مجموعہ تھے بل کہ ایک دفاعی نوعیت کے بھی حامل تھے۔ (۱۱۰) اطم کے اردگرد کی زمینیں عام طور پر اس میں بسنے والے قبیلے کی ملکیت ہوتی تھیں۔ ان بستیوں میں سے ایک بستی کا نام یثرب تھا، جو نسبتاً بڑی ہونے کے علاوہ بستیوں کے مرکز میں تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس سارے علاقے کو یثرب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ (۱۱۱) مدینے کا اس طرح سے پھیلا ہونا اسلامی ریاست کے قیام کے لئے بہت ممد ومعاون ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مدینے میں جب اسلام کی اشاعت ہوئی تو وہ مدینے کے طول وعرض میں آباد اوس اور خزرج کے قبائل میں پھیل گئی، جس کے باعث بقیہ قبائل اپنے آپ کو مسلمانوں میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہوں گے، لہٰذا انہیں رسول اللہ ﷺ کی سیادت تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ دو سال کے اندر مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو مساجد قائم ہوئیں اور ان میں اضافہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک ان کی تعداد چالیس ہوگئی۔ (۱۱۲) اس کا ایک باعث مسلمانوں کا بڑی تعداد میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینے میں آباد ہو جانا بھی تھا۔

آبادی کے بڑھ جانے سے نئے مکانات کی تعمیر عمل میں آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے بھی ہدایات جاری کیں۔ مثلاً یہ کہ گلی کی کشادگی کم از کم سات ہاتھ رکھنے کی ہدایت کی گئی، تاکہ آمد ورفت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ بڑے بڑے مکانات بنانے کی حوصلہ شکنی کی گئی جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ مہاجرین کے باعث جس تیزی سے آبادی بڑھ رہی تھی بڑے مکانوں کی وجہ سے جگہ کم پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ دوسرا یہ کہ مسلمان زیادہ تر غریب تھے، لہٰذا بڑے اور عالی شان گھروں کی تعمیر سے مسلمانوں میں طبقاتی تقسیم پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا، جو دور حاضر کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ چناں چہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو رشتے میں رسول اللہ ﷺ کے ماموں تھے ایک بڑا مکان بنانا چاہا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ جب حضرت سعدؓ کو آپ ﷺ کی ناپسندیدگی کی خبر ہوئی تو انہوں نے مکان کا وہ حصہ گرا دیا جسے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ لیکن یہ ناپسندیدگی عالی شان مکانوں کے لئے تھی، جب کہ کشادہ مکانوں کو رسول اللہ ﷺ پسند فرماتے۔ ایک حدیث میں ایک مکان کی ضروریات کی نشان

دہی بھی فرمائی کہ ایک مکان میں آدمی کے اپنے رہنے کے لئے ایک کمرہ ہونا چاہئے، اس کے بچوں کے لئے کمرہ، مہمانوں کے لئے کمرہ، ملازموں کے لئے کمرہ اور غیر ضروری تعمیر کی حوصلہ شکنی فرمائی گئی۔

ہجرت کے بعد کے مدینے کی آبادی کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق دس ہزار تھی جب کہ دوسری آرا کے مطابق پندرہ ہزار تھی۔ سمہودی کے ہاں قبائل اور عشائر کی جو تفصیل ملتی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مدینے کی آبادی دس اور پندرہ ہزار سے کم کسی طور پر بھی نہیں تھی۔ البتہ مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں صحیح بخاری میں واضح طور پر موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی مردم شماری کا حکم دیا تو وہ پندرہ سو مرد تھے۔ (۱۱۳) البتہ اس بات کا سن متعین کرنا مشکل امر ہے۔ بعض سیرت نگاروں کے مطابق مردم شماری کا یہ کام ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا۔

دیگر عرب کی طرح مدینے کا معاشرہ بھی قبائلی تھا، گو جغرافیائی وحدت نے مدینے کے لوگوں میں تمدن کے آثار بھی پیدا کر دیئے تھے اور یہ قبائل اس طرح سے مل جل کر رہتے تھے کہ ان کی آپس میں شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ قبیلے کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ اس کے مختلف درجے ہوتے تھے جنہیں عربی میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، لیکن اردو میں ہر گروہ کے لئے قبیلے ہی کا لفظ مستعمل ہو گیا۔ ان درجوں کی مثال ہم قریش کے قبیلے سے لے سکتے ہیں جو فہر بن مالک کی اولاد تھا جو رسول اللہ ﷺ سے دسویں پشت پر تھے۔ لہٰذا قبیلہ ایک قدیم نسبت ہوتا تھا، جس کی نسل کئی شاخوں میں بٹ چکی ہوتی تھی۔ مدینے میں اوس اور خزرج دو قبائل تھے۔ قبائل کی ذیلی شاخ عشیرہ کہلاتی تھی جو نسبتاً کم پشتوں کے باپ کی اولاد ہوتی تھی جس کے لئے عام طور پر جد امجد کی اصطلاح مستعمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد قصی بن کلاب کی اولاد ایک عشیرہ تھی۔ عشیرہ کی ذیلی تقسیم بطن تھی، جو ایک دادا یا پڑدادا کی اولاد ہوتی تھی، جیسے بنی ہاشم۔ پھر ایک بطن میں کئی اسرے ہوتے تھے جو عام طور پر ایک دادا کی اولاد ہوتے تھے جیسے رسول اللہ ﷺ کا اسرا بنی عبد المطلب تھا۔ بعینہٖ ان ہی بنیادوں پر مدینے کے قبائل کی تقسیم بھی تھی۔ البتہ ان قبائل اور ان کے ذیلی گروہوں کا تفصیلاً احاطہ کرنا ایک نہایت محنت طلب کام ہے جس کا ایک مظہر ہمیں علامہ سمہودی کی کتاب میں ملتا ہے، جس کا ذکر ہو چکا۔

عشائر کے حوالے سے بہت عمدہ معلومات ابن سعد نے فراہم کی ہیں، کیوں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کے کے زمانے کے مرتب کردہ دیوان کی دستاویزات کا خود مشاہدہ کیا تھا جس میں لوگوں کی تن خواہیں قبائل اور عشائر کی بنا پر مقرر ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے ان عشائر کا بھی ذکر کیا ہے جو بعد میں ختم ہو گئے اور

ان کے ختم ہونے کے اسباب بھی لکھے ہیں۔ان ختم ہونے والے عشائر میں سے زیادہ تر انصار کے تھے اور یہ امر رسول اللہ ﷺ کی ایک پیشین گوئی سے مطابقت رکھتا ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کی کہ میں انصار کے بارے میں تمہیں نیک سلوک اور احسان کی وصیت کرتا ہوں، لوگوں کی آبادیاں بڑھتی جائیں گی اور انصار کی آبادی کم ہوتی جائے گی اس لئے انصار کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آنا اور مرے ساتھ انہوں نے جو نیکی کی ہے اس کا پورا پورا اجر دینے کی کوشش کرنا۔(۱۱۴) لہٰذا انصار کے عشائر ان کے لوگوں کے جہاد میں چلے جانے کے باعث یا ریاستی ذمے داریوں کے لئے دوسرے علاقوں میں بس جانے کے باعث مدینے سے ختم ہو گئے اور اب تاریخ میں صرف ان کے تذکرے ملتے ہیں۔

عرب میں رائج بت پرستی سے مدینہ بھی مبرا نہیں تھا، حال آں کہ وہاں یہودیوں کے قبائل آباد تھے جو توحید پرست تھے اور مقامی آبادی پر ان کا اس قدر اثر تھا کہ دیگر قبائل صحت یابی کی منت کے طور پر اپنے بچوں کو یہودیوں کے مدارس میں داخل کروا دیتے جہاں وہ بچے یہودیت بھی اختیار کر لیتے تھے اور ان کے والدین اس کو برا نہ جانتے تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا بت تھا جن کے مجسمے گھروں میں رکھے ہوتے تھے۔(۱۱۵) منات جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ مدینے کے قبائل کی دیوی تھی۔اس کے بت بھی بہ کثرت گھروں میں موجود تھے۔ یہودیت اور بت پرستی کے علاوہ چند ایک لوگ حنفا بھی تھے جو ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر قائم تھے۔ان میں ایک سوید بن صامت تھے جن کا ذکر پچھلے باب میں بیعت عقبہ کے ضمن میں ہو چکا۔اس کے علاوہ اسعد بن زرارہ اور ابوالہیثم بن تیہان کے بارے میں بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ حنفا میں سے تھے۔

مدینے کی معاشرت اور معیشت کو سمجھنے کے لئے قبائل یہود کا تذکرہ بہت ضروری ہے، کیوں کہ وہ ہر میدان میں مدینے کی معیشت پر چھائے ہوئے تھے اور دیگر قبائل ان کے سودی کاروبار کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ مسجد نبوی سے قریب ترین بنوقینقاع تھے اور انہی کو سب سے پہلے مدینہ بدر کیا گیا۔ (۱۱۶) یہ لوگ تاجر تھے۔اس کے ساتھ ساتھ دست کاری کے بھی ماہر تھے۔سونے، لوہے اور بڑھئی کا کام یہی کرتے تھے۔اس طرح مدینے کے پورے بازار اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔مدینہ منورہ کا سب سے بڑا بازار بھی ان ہی کا تھا۔ یہ تعداد میں ساڑھے تین چار ہزار کے قریب تھے جن میں سات سو مرد قابل جنگ تھے۔ بنونظیر قبا کے قرب و جوار میں آباد تھے اور مدینے کی زراعت پر قابض تھے، کیوں کہ بڑے پیمانے پر زرعی زمینوں کے مالک تھے۔غزوہ احد کے بعد انہیں مدینے سے نکال دیا گیا تھا۔ بنوقریظہ سب سے دور

آباد تھے اور سب سے آخر میں انہیں مدینے سے نکالا گیا جب انہوں نے غزوہ خندق میں غداری کی۔ جبرائیل امین کے حکم پر ان کے خلاف کاروائی کی گئی۔ پہلے دونوں قبائل کو اس شرط پر کچھ نہ کہا گیا تھا کہ انہیں مدینے سے نکل کر خیبر جانے دیا جائے۔ لیکن بنوقریظہ کی اس پیش کش کو قبول نہیں کیا گیا۔ ان ہی کے مطالبے پر سعد بن معاذ کو اس معاملے میں ثالث مقرر کیا گیا جنہوں نے توراۃ کے حکم کے مطابق (۱۱۷) سپاہیوں کے قتل اور عورتوں بچوں کو غلام بنا لینے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ (۱۱۸)

مدینے میں ایک گروہ ایسا تھا جو مسلمانوں کے آجانے سے پیدا ہوا اور وہ منافقین تھے جو بہ ظاہر مسلمان تھے لیکن اندر سے وہ اسلام کے خلاف تھے۔ عبداللہ بن ابی سلول جسے ہجرت سے قبل اوس وخزرج کا سردار بنانے کا فیصلہ ہو گیا تھا اس گروہ کا سردار تھا۔ لہٰذا مدینے کے معاملات میں اس گروہ کا بھی بہت عمل دخل تھا۔ خاص طور پر یہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو، تاکہ اسلام کی جڑ اس خطے سے کٹ جائے۔ اس کے لئے وہ پرانی عصبیتوں کو ہوا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی حسن تدبیر سے ایسی ہر کوشش کو ناکام بنایا (۱۱۹) اور فرمایا کہ اسلام سے پہلے جتنے حلف اور ولا تھے اسلام نے ان کو مزید پختہ بنا دیا ہے۔ (۱۲۰)

یہ بیان ہو چکا کہ یہود کو مدینے سے نکال دیا گیا تھا اور وہ وہاں سے خیبر جا کر آباد ہو گئے۔ بعد میں خیبر اور اس کے ساتھ دیگر یہودی آبادیوں فدک اور ام القری کو بھی فتح کر لیا گیا۔ (۱۲۱) مدینے سے یہودیوں کے چلے جانے سے ان کی زمینوں اور کاروباری لین دین کا کیا معاملہ ہوا اور اسی طرح خیبر وغیرہ کے فتح ہو جانے سے ان سے لگان کے کیا ضابطے طے ہوئے، یہ مدینے کی معیشت کا ایک اہم باب ہیں، جن کو بیان کرنا مقصود ہے۔

جب بنوقینقاع اور بنونضیر کے خلاف کاروائی کا فیصلہ ہوا اور انہیں خیبر جلاوطن کر دیا گیا تو اس وقت ان کے بہت سے قرضے اور سود انصاری صحابہ پر واجب الادا تھے۔ اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت تھی کہ یہودی اصل دعاوی میں تھوڑی کمی کر کے جلد لے لیں یعنی اگر رقم ایک سال کے بعد واجب الادا ہے اور اس کی مالیت ایک لاکھ ہے تو پھر نوے ہزار لے لو اور آج وصول کر لو۔ (۱۲۲) اس کے علاوہ مسئلہ ان زمینوں کا تھا جو یہودیوں نے دوسری بستیوں میں خرید رکھی تھیں۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ طے کیا کہ انہیں جبری طور پر فروخت کر کے قیمت یہودیوں کو دے دی گئی۔ (۱۲۳) اس کے بعد خیبر والوں کا معاملہ آیا تو اسے چوں کہ فتح کیا گیا تھا اس لئے وہاں کے یہودیوں کو جلاوطن کر کے

زمین سپاہیوں میں تقسیم کردی گئی۔ (۱۲۴) جب کہ فدک کے یہودیوں نے مصالحت کرلی تھی، اس لئے ان کی پیداوار کا آدھا حصہ مدینے کو دیا جانا طے پایا جب کہ زمینیں سرکاری ملکیت قرار پائیں اور اس پر کام کرنے والے مزدور قرار پائے۔ ان شرائط کے مطابق جس کے لئے مخابرہ، مناصفہ، مزارعہ بہت سی اصطلاحات محدثین نے استعمال کی ہیں فدک کی اراضی کا بندوبست ہوا۔ یہی انتظام خیبر اور ام القریٰ کے بعض علاقوں کے لئے کیا گیا۔ جب پیداوار کا وقت آیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ کو مدینے کا حصہ لینے کے لئے بھیجا۔ یہودیوں نے انہیں رشوت دینے کی کوشش کی تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے مختلف اجناس اور اجناس میں مختلف درجہ بندی کے مطابق پیداوار کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ جو چاہیں حصہ لے لیں۔ یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی بے اختیار پکار اٹھے **بھذا قامت السماوات والارض** ''اسی عدل کی وجہ سے زمین وآسمان قائم ہیں''۔

معیشت کے حوالے سے مدینہ پورے جزیرہ عرب میں اہمیت کا حامل تھا، کیوں کہ یہاں زراعت اور تجارت دونوں کے مراکز تھے، جب کہ مکہ میں صرف تجارت اور طائف میں صرف زراعت کے مراکز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مہاجرین مدینے میں آئے تو تجارت پر سے یہودیوں کا زور ٹوٹنے لگا، کیوں کہ مہاجرین تجارت میں مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام بہت نمایاں ہے جنہوں نے مدینے کے بازار پر سے یہودیوں کی اجارہ داری کو ختم کیا۔ زراعت کے حوالے سے مدینے کی بڑی بڑی پیداوار میں کھجور، جو، انجیر، انار اور کیلا کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ عام طور پر لوگوں کی غذا جو ہوتی تھی جب کہ گندم خیبر میں پیدا ہوتا تھا، لہٰذا مدینے میں بہت مہنگا ملتا تھا۔ (۱۲۵) انگور بھی بہت پیدا ہوتا تھا اور اس حوالے سے شراب کا کاروبار بھی عروج پر تھا جو بعد میں مسلمانوں کے اجتناب کے باعث ختم ہوگیا۔ مدینے میں جو لوگ زمینوں کے مالک تھے وہ مختلف حیثیتوں کے تھے۔ جو چھوٹے قطعات کے مالک تھے وہ اپنی زمینوں پر خود کام کرتے تھے جب کہ بڑے زمین دار مختلف طریقوں سے دوسروں سے کام کروایا کرتے تھے جن میں مزارعت اور محاقلہ زیادہ مشہور تھے۔ زیادہ تر زمین بارانی تھی جہاں سال میں ایک مرتبہ پیداوار ہوتی تھی اور جہاں کہیں کنویں تھے وہاں دو مرتبہ پیداوار ہوتی تھی۔ دست کاری میں گھریلو دست کاری بھی تھی اور اجتماعی دست کاری بھی۔ گھریلو دست کاری میں عموماً کپڑے، سوت کاتنے، دھاگہ بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ بڑی دست کاری میں زراعت، لوہاری اور نجاری کے آلات بنائے جاتے تھے۔ اس پر عام طور پر بنوقینقاع کی اجارہ داری تھی۔ مدینے کے تاجر باہر سے بھی سامان لاکر مدینے

کی منڈی میں فروخت کرتے تھے، جس کے لئے انہوں نے شام اور اردن میں باقاعدہ تجارتی کوٹھیاں بنا رکھی تھیں۔ بنونضیر کے یہودی اس کام میں بہت نمایاں تھے۔ (۱۲۶)

اسلام کی حکمت تشریع کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاملات اور تجارت کے ابواب میں اصل چیز حلت ہے حرمت نہیں، یعنی جو لوگ کاروبار کر رہے ہیں اگر وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہیں تو وہ جائز ہے۔ سورہ بقرہ جو ہجرت کے ایک دو سال بعد نازل ہوئی اس میں تجارت کے بارے میں بعض بنیادی احکامات دیئے گئے ہیں۔ یہ کہا گیا کہ تجارت وہ ہے جو آپس کی رضامندی سے ہو اور جس کام میں دھوکہ اور استحصال ہو وہ جائز نہیں۔ لہٰذا لین دین میں سود، مزارعت کی وہ شکلیں جن میں استحصال لازم آتا تھا، اسی طرح بازار کی قیمتوں پر اجارہ داری اور ناپ تول میں کمی کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ سب کچھ آناً فاناً نہیں ہوا بل کہ ان تمام چیزوں کے سد باب کے لئے طویل المیعاد بنیادوں پر حکمت عملی اپنائی گئی، جس کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

یہودی اپنے بازاروں میں دوسروں کی نہیں چلنے دیتے تھے، خاص طور پر نرخ متعین کرنے کے معاملے میں صرف ان کی چلتی تھی۔ وہ جس چیز کی جتنی قیمت متعین کر دیتے اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ گو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اس زور کو توڑ دیا اور ابو رافع بھی جس کا بازار میں سکہ قائم تھا، ان کی کام یابی کے آگے بند نہ باندھ سکا۔ لیکن یہ کام ہر مسلمان کے بس کا نہیں تھا، لہٰذا چھوٹے تاجر وہاں بے بس تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض ضابطوں کے ذریعے اس اجارہ داری کو ختم کیا۔ اس اجارہ داری کی ایک وجہ یہ تھی کہ بڑے تاجر مال بازار میں آنے سے قبل ہی خرید لیا کرتے تھے اور اپنی من مانی قیمت پر بیچا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ تلقی الجلب کی خاص اصطلاح سے اس کی ممانعت فرما دی۔ اس سے مراد یہ تھا کہ مال کو بازار میں آنے سے کوئی نہ روکے، تاکہ اس کی قیمت کے بارے میں ہر کوئی آگاہ ہو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: لایبیع حاضر لباد جس کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کوئی شہری آدمی دیہاتی کے لئے مال فروخت نہ کرے۔ (۱۲۷) یہ بھی تلقی جلب کی ایک شکل ہے۔ شہر کے لوگ گاؤں کے لوگوں کی مصنوعات بہت سستے داموں خرید کر شہر میں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ (۱۲۸) یہ استحصال اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے کہ ادھار کی خرید و فروخت ادھار سے درست نہیں۔ آپ کا کسی کے ذمے قرض ہے اور اس کی رقم کسی اور کے ذمے واجب الادا ہے، ان دونوں رقموں کا تبادلہ آپس میں جائز نہیں۔ کم از کم ایک طرف کی چیز نقد ہونی چاہئے اور اس کو موقع پر

موجود ہونا چاہئے۔ (۱۲۹) ان ہدایات کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو عملی کام کیا وہ تھا مسجد نبوی کے قریب مسلمانوں کے ایک بازار قائم کرنا جہاں مسلمان یہودیوں کے ہتھکنڈوں سے بچ کر اپنا کاروبار کر سکتے تھے۔ یہاں ان خوامخواہ کے ٹیکسوں سے بھی ان کی جان چھوٹ گئی جو یہودی ان سے وصول کرتے تھے۔ مزید فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس بازار میں مال بیچے گا وہ اسی اجر کا مستحق ہوگا جس کا جہاد کرنے والا مجاہد مستحق ہے جب کہ اس بازار میں ذخیرہ اندوزی کرنے والا ایسے ہے جیسے اللہ کی کتاب میں الحاد کرنے والا۔ (۱۳۰)

بازار کو صحیح خطوط پر قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بازار میں اوزان اور پیمانے متعین ہوں۔ اس زمانے میں مختلف علاقوں میں مختلف پیمانے متعین تھے اور جس کا زور چلتا وہ ایک ہی شہر میں لینے دینے کے مختلف پیمانے رکھ لیتا، تاکہ ناپ تول میں کمی بیشی کر سکے۔ ابورافع نے جس کا ذکر ہوا اسی طرز عمل کو اپناتے ہوئے لینے دینے کے مختلف پیمانے قائم کر رکھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس ضمن میں بھی احکامات جاری فرمائے، تجارت اور زراعت کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے بالترتیب مکے اور مدینے کے پیمانوں کو رائج کیا۔ (۱۳۱) اس کی وجہ یہ تھی کہ تجارت مکے میں زیادہ تھی، اس لئے اس کے پیمانے زیادہ صحیح تھے، جب کہ زراعت مدینے میں زیادہ تھی اس لئے اس کے پیمانے کو اختیار کیا گیا۔ یہ بات کہ مکے اور مدینے میں رائج پیمانوں اور اوزان کی موجودہ پیائش کیا تھی بڑی تحقیق کا موضوع ہے، جس کی اہمیت صرف تاریخی نہیں بل کہ یہ فقہیات سیرت کا موضوع ہے۔ وہ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف قسم کی لازمی ادائیگیوں کے لئے بعض احکام بیان فرمائے۔ مثال کے طور پر صدقہ فطر کے لئے ایک پیمانے کا ذکر ہے۔ بہت سے حضرات نے اس پر کتابیں لکھیں۔ ایک مالکی فقیہ نے کتاب لکھی ہے جس کا نام بڑا دل چسپ ہے۔ **اثبات مالیس منه بد لمن ارادالوقوف علی حقیقة الدینار والدرهم والصاع والمد** کہ آپ ﷺ کے زمانے میں جو صاع، مداود ینار رائج تھے اس کو کیسے ثابت کیا جائے۔ پاکستان میں بھی مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ اوزان شرعیہ لکھا، جس میں انہوں نے اپنی تحقیق سے ان تمام اوزان کا آج کل کے پیمانوں سے الگ الگ وزن مقرر کیا ہے۔

مدینے میں بارٹر کا نظام بھی ہوتا تھا اور یہودیوں نے اسے بھی اپنی بالادستی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چوں کہ صنعت پر ان کا قبضہ تھا، لہٰذا جب فصل پک جاتی تو وہ لوگوں کو اپنی مصنوعات یا پہلے سے ذخیرہ شدہ زرعی اجناس کم مقدار میں پیش کر کے ان کی عمدہ فصل جو ابھی کٹنے والی ہوتی کا سودا کر لیتے اور دوسرا فریق

اپنی ضرورت کے تحت ایسا کرنے پر مجبور ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کے لین دین کو بھی سود میں شامل کیا، جسے ربا الفضل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ربا الفضل میں چھ چیزوں کا بیان ہے جن میں سونا، چاندی، جو، کھجور، گندم اور نمک شامل ہیں۔ ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ ان کی خرید وفروخت دست بہ دست ہو۔ (۱۳۲) کسی قسم کی زیادتی ربا الفضل کے زمرے میں آئے گی۔ اس چیز کے دو فائدے ہوئے، ایک تو بارٹر کے نظام میں کمی آئی اور زری معیشت یعنی مانیٹری اکانومی کو فروغ ملا، جس میں چیزوں کی قدر متعین ہوتی ہے، یعنی کوئی چیز کس نرخ پر بکی اور کس نرخ پر خریدی گئی۔ دوسرا یہ کہ یہودیوں کے استحصال کا خاتمہ ہوگیا۔ سود کی اس قسم کو فقہاء ربا الفضل کے علاوہ ربا البیع اور ربا الحدیث کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ سود کا یہ حکم ان ہی چھ چیزوں پر لاگو ہوتا ہے یا بقیہ چیزیں بھی اس کے زمرے میں آتی ہیں تو زیادہ تر کی رائے موخر الذکر صورت کے موافق ہے۔

اس کے علاوہ طاقت کے اظہار کا ایک اور سلسلہ بھی رائج تھا کہ بعض سردار اپنی قوت کے بل بوتے پر جنگلات اور چراگاہوں پر قبضہ کر لیتے اور جانوروں کے لئے مخصوص کر دیتے۔ اس کو حمی کہا جاتا تھا۔ اس پر جنگیں بھی ہوئیں جو پشتوں جاری رہیں۔ ان میں ایک مشہور جنگ داحس وغبرا کی تھی جو کسی حمی میں کسی دوسرے کی اونٹنی کے چلے جانے کے باعث شروع ہوئی۔ اس جنگ کی داستان عربی ادب کا ایک حصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح سے حمی رکھنے کی ممانعت فرمادی اور ایسی جگہوں کو صرف ریاست کا حق قرار دیا۔ (۱۳۳) اس سلسلے میں آخری بات پھر گھوم کر میثاق مدینہ پر آجاتی ہے، جس نے مدینے کو ایک ریاست کا درجہ دیا کہ معاہدات کرتے وقت رسول اللہ ﷺ یہ بات بھی طے کرتے کہ معاہدے میں شامل ہونے والا قبیلہ سود کا کاروبار نہیں کرے گا اور اگر ایسا ہوا تو معاہدہ منسوخ ہوجائے گا۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدے میں یہ شق موجود تھی، لیکن انہوں نے اپنی روش ترک نہ کی۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ان کے خلاف شکایت ملی اور اس کے صحیح ثابت ہونے پر حضرت عمرؓ نے انہیں شام کے علاقے میں جلاوطن کر دیا۔

معاشرت اور معیشت سے متعلق چند انتظامی شعبوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ پہلا انتظامی معاملہ جو رسول اللہ ﷺ کو درپیش تھا وہ امن وامان کا تھا۔ اس بارے میں خارجی امور کا تذکرہ تو ہو چکا اب داخلی امور کے حوالے سے کچھ باتوں کو بیان کیا جائے گا۔ ہجرت سے قبل مدینے میں جرائم بہت ہوتے تھے اور ان میں زیادہ ہاتھ یہودیوں کا ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے سد باب کے لئے رات کو

پہرے کا انتظام کیا اور بعض لوگوں کو اس کی ذمے داری سونپی۔ تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسیلمہ انصاریؓ کو رسول اللہ ﷺ نے مدینے کے امن وامان کا ذمہ دار بنایا تھا۔ ان کے مختلف کارندے تھے، جو مختلف علاقوں اور قریب کے دیہات میں جا کر امن وامان کا خیال رکھتے تھے۔ جیسے جیسے مسلمان آبادیاں بڑھتی گئیں امن وامان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ خاص طور پر یہود کے مدینہ بدر ہونے سے جرائم میں کافی کمی آ گئی۔

مدینے میں پڑھنے لکھنے کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ سوید بن صامت جن کا ذکر ہو چکا پڑھے لکھوں میں شمار ہوتے تھے۔ البتہ ہجرت کے بعد اس عمل کو باقاعدہ بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ چناں چہ تمام مساجد میں درس وتدریس کا انتظام تھا اور اس نظام کے سربراہ حضرت عبادہ بن صامتؓ تھے۔ وہ تمام مساجد میں خود جا کر درس وتدریس کی نگرانی فرماتے۔ صفہ اس حوالے سے بہت اہم مرکز تھا جہاں مستقبل کے فاتحین تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ صفہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ درس وتدریس کے حوالے سے ایک نمایاں نام حضرت معاذ بن جبلؓ کا ہے۔ جیسے جیسے دوسرے علاقے فتح ہوتے گئے رسول اللہ ﷺ وہاں تعلیم کے لئے لوگوں کو بھیجتے رہے۔ عمرو بن حزمؓ کو سترہ سال کی عمر میں یمن بھیجا تھا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو فتح مکہ کے بعد کچھ دن مکہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ہجرت سے قبل اس مقصد کے لئے مدینے بھیجا تھا۔ ان کے علاوہ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابودرداؓ، حضرت اسید بن حضیرؓ، حضرت خالد بن سعیدؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے نام بڑے نمایاں ہیں۔

باب ہشتم: کلامیات سیرت

کلامیات سیرت کی دو جہتیں ہیں۔ اولاً وہ موضوعات جو اصلاً علم الکلام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سیرت کے واقعات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ثانیاً سیرت کے وہ پہلو جن کو سمجھنے کے لئے کلام کا مطالعہ ضروری ہے۔ کلامیات سیرت کا اصل موضوع ثانی الذکر مباحث ہیں لیکن ضمناً اول الذکر مباحث بھی اس میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر رسالت ونبوت، وحی اور معجزات کی بحث اول الذکر مباحث سے تعلق رکھتی ہے، جب کہ رسالت، وحی اور معجزات کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کے امتیازی خصائص ثانی الذکر مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیر نظر بحث ان دونوں رجحانات کے تداخل کا مطالعہ ہے۔

جب علما بڑے پیمانے پر علوم کو مدون کر چکے تو اس کی توجیہ کا سلسلہ شروع ہوا، جس سے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ علم کلام پہلے نقلی تھا لیکن یونانی فلسفے سے روشنائی نے عقلی علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس کے سرخیل امام غزالیؒ تھے۔ (۱۳۴) فلسفہ حقیقت کو آشکارا کرنے کی کوشش کا نام ہے، اور حقیقت ہر عہد اور ہر جگہ طبیعیات اور مابعد از طبیعیات کا مرکب ہے۔ طبیعیات مادہ ہے اور مابعد از طبیعیات مادے کا آغاز کہ حادث ہے یا قدیم۔ مابعد از طبیعیات کا طبیعیاتی منطق سے اثبات ممکن ہوتا ہے۔ یونانی فلسفی خاص طور پر ارسطو دیوتاؤں کی سیادت کے قائل تھے اور اس اثر سے مادے کی مابعد از طبیعیاتی تخلیق کے بھی، لیکن انہوں نے اس کو طبیعیات کی زبان میں بیان کرنا ضروری جانا اور اس کے لئے منطق کو ایجاد کیا۔ لہٰذا ارسطو مادے کی مختلف حالتوں کے خواص کو اس ترتیب سے بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا جس ترتیب سے وہ دیوتاؤں کی تخلیق سے منسوب تھیں۔ (۱۳۵) قرآن وحدیث میں بھی مابعد از طبیعیاتی حقیقتوں کو طبیعیاتی زبان میں بیان کیا گیا ہے، لیکن ان کے تعلق کی توجیہ نہیں کی گئی۔ مثلاً ایمان ایک مابعد از طبیعیاتی حقیقت ہے اور اس کا رتی بھر ہونا یا احد پہاڑ کے برابر ہونا طبیعیاتی اظہار ہے۔ ان کے تعلق کی توجیہ نے علم کلام کو جنم دیا، جو پہلے پہل اپنے دلائل نقلی علوم سے اخذ کرتا تھا اور بعد میں اس کی جگہ عقلی علوم نے لے لی۔ علم کلام کے ساتھ ساتھ حقیقت تک رسائی کا ایک اور رجحان پروان چڑھا جسے تصوف کہا جاتا ہے۔ (۱۳۶) اس میں عقل کی جگہ اندرونی احساس کو جسے وجدان کہا جاتا ہے حقیقت تک رسائی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ (۱۳۷) اس سے عقل اور دل کی بحث چھڑ گئی، جس سے عقلی اور نقلی علوم کے ساتھ باطنی علوم کی اصطلاح بھی وجود میں آ گئی جس کا تعلق خالص دل کے ساتھ ہے۔ مولانا روم عقلی علوم کو علم حصولی کہتے ہیں، جب کہ جن کا تعلق قلب کے ساتھ ہے ان کے لئے علم حضوری کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ علم حصولی چوں کہ تجربے، مشاہدے اور استدلال پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس کا دائرہ کار بہت محدود ہے اور وہ کائنات کی حقیقتوں کا بہت کم ادراک کر سکتا ہے۔ مولانا روم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ جس ترازو سے سونا اور ہیرے تولے جاتے ہیں اس سے پہاڑ نہیں تولے جا سکتے۔ عقل بلاشبہ ایک ترازو ہے لیکن وہ کچھ خاص قسم کی چیزوں کو تول سکتی ہے اور اگر اس سے وہ چیزیں تولنے کی کوشش کی جائے جو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں تو یہ عقل کا صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ لہٰذا پیغام الٰہی کا صحیح درک حاصل کرنے کے لئے علق کے ساتھ دل کی دنیا بھی آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ علم کلام کی داغ بیل پڑنے سے قبل ہی علمائے اسلام کے ہاں کچھ کلامی

مسائل پیدا ہو گئے تھے، جن کا جواب محدثین نے اپنے طرز استدلال سے دینے کی کوشش کی۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ خلق قرآن کا تھا، جو بنیادی طور پر فلسفے اور عقائد سے متعلق تھا لیکن معارف نبوت کی روشنی میں اس کا حل محدثین نے فراہم کیا۔ یونانی فلسفے اور منطق کو بنیاد بنا کر اسلامی عقائد کی تشریح میں ابونصر فارابی کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ انہیں معلم ثانی کہا جاتا ہے (معلم اول ارسطو کو کہا جاتا ہے)۔ اس لئے کہ انہوں نے نبوت اور وحی کو سب سے پہلے فلسفے اور عقلیات کی زبان میں پیش کیا۔ اس عمل کو حکیم ابن سینا نے مزید گہرائی اور گیرائی بخشی اور خاص نبوت کے ماخذ علم ہونے کا تصور ابن سینا کے اہم مسائل اور مضامین میں سے ایک ہے۔ پھر آگے چل کر حکیم ابن رشد نے جو منطقی، فلسفی اور حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ نام ور اصولی، فقیہ اور متکلم بھی تھے اس کو شریعت سے زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا یونانی فلسفے کے ورود سے قبل ہی سیرت اور دیگر اسلامی علوم میں فلسفے اور منطق کی طرز پر غور وخوض شروع ہو چکا تھا۔

یہ وہ مختلف رجحانات تھے جو کلامیات کے ضمن میں اختیار کئے گئے۔ اب ہم سیرت کے حوالے سے کلامیات کے مندرجات کو زیر بحث لائیں گے۔ سیرت کے حوالے سے سب سے پہلی بات عمومی طور پر سابقہ نبوتوں (۱۳۸) اور خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بارے میں بحث ہے۔ (۱۳۹) سلسلے میں سیرت کا خالص پہلو جسے کلامیات کے زمرے میں لایا جاتا ہے یہ ہے کہ سیرت نگاروں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کو پہلی نبوتوں کے تناظر میں دیکھا ہے اور ہر کسی نے سیرت کا آغاز گزشتہ پیغمبروں کے تذکرے سے کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس سلسلے میں ایک منفرد انداز اپنایا ہے۔ انہوں نے مختلف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں جو ارتقا ہوا ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آنے تک دنیا ایک ایسے مرحلے پر آ گئی تھی جب بین الاقوامیت اور عالم گیریت کا آغاز ہونے والا تھا۔ اس وقت ضرورت تھی ایک ایسا دین بھیجا جائے جو تمام ادیان کا ناسخ ہو اور ایسی شریعت نازل کی جائے جو تمام شریعتوں کو مکمل کرنے والی ہو اور لیظہرہ علی الدین کلہ کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔ (۱۴۰) اسی سے منسلک ختم نبوت کا عقیدہ ہے جو ظاہری بات ہے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر بے شمار لوگوں نے قلم اٹھایا اور اس کے کلامی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اس حوالے سے علامہ اقبال نے ایک بڑا لطیف نکتہ بیان کیا۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ نبوت کے تین بنیادی عناصر ہیں، مابعد از طبیعی ذرائع سے علم حاصل ہونا، اس علم کا قطعی ہونا اور اس علم کا واجب التعمیل ہونا۔ جو شخص ان تینوں چیزوں کا مدعی ہو

خواہ وہ نبوت کی اصطلاح اپنے لئے نہ بھی استعمال کرے وہ نبوت کا دعوے دار ہوگا اور اس بنا پر واجب القتل قرار پائے گا۔ نبوت سے منسلک تصور وحی کا ہے جو نبی کا ذریعہ علم ہوتا ہے۔ وحی کے دو مفہوم بیان ہوئے ہیں۔ عمومی مفہوم کسی کو تیزی اور خاموشی سے اشارہ کر دینے کا ہے، یعنی انتہائی لطیف پیرائے میں پیغام صاحب وحی تک پہنچ جانا۔ دوسرا مفہوم ہے کسی جگہ ایسا نقش چھوڑ دینا جو مٹ نہ سکے۔ وحی پر بھی بے شمار مباحث موجود ہیں۔

کتب کا تعارف

دلائل نبوت پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں سب سے قدیم اور مستند کتاب علامہ ابونعیم اصفہانی کی دلائل النبوۃ ہے۔ بعد میں ابونعیم نے خود ہی دو جلدوں میں اس کا خلاصہ لکھا جو آج دست یاب ہے، جب کہ اصل ضخیم کتاب ناپید ہے۔ کتاب میں ۱۳۵ ابواب یا فصلیں ہیں۔ شروع میں ایک بہت فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں انسانی نفسیات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ انسانوں میں چار قسم کی اخلاقی و روحانی خوبیاں اور چار قسم کی کم زوریاں پائی جاتی ہیں۔ نبی ان چاروں خوبیوں سے مکمل طور پر متصف اور چاروں خامیوں سے پاک ہوتا ہے۔ کتاب کے اہم مباحث میں قرآن مجید کے فضائل، آپ ﷺ کا سردار انسانیت ہونا، کتب مقدسہ میں آپ ﷺ کے تذکرے، آپ کے اخلاق عالیہ، آپ ﷺ کے صفات فاضلہ، وحی نبوت، تاثیر قرآن اور آپ ﷺ کے معجزات شامل ہیں۔

جن حضرات نے کلامیات سیرت پر مستقل بالذات کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک نمایاں نام قاضی عیاض کا ہے۔ ان کی کتاب کا نام الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ ہے۔ انہوں نے کتاب کی بنیاد اس قرآنی آیت پر رکھی ہے جس میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اب وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کا یہ جو قرآنی وعدہ کیا گیا، اس سے چار قسم کی حفاظتیں مراد ہیں۔ جسمانی تحفظ دشمنوں کے شر سے، علمی تحفظ قرآن کی حفاظت کے ضمن میں، روحانی تحفظ مرتبے کے حوالے سے اور قلبی عصمت کی حفاظت۔ ان پر ایک ایک کر کے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

کلامیات سیرت پر ایک اہم کام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے جن کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا موضوع ہی کلامیات سیرت ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سنت کے وہ حقائق اور معارف بیان کئے ہیں جو عام انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں، ابھی تک کوئی شاہ ولی

اللہ کے اس کام میں مزید اضافہ نہیں کر سکا۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کلیات اور اصولوں سے بحث کی ہے اور اس میں علوم نبوت کی اہمیت کو ایک محور کے طور پر اجاگر کیا ہے۔ دوسرے حصے میں اسرار نبوت وشریعت بیان کئے گئے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کے بنیادی مقاصد میں میرے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کے معجزات کو اس طرح نمایاں کر کے پیش کرنا ہے کہ شریعت کا اصل کارنامہ سامنے آجائے۔ شاہ صاحب نے کتاب کے چھٹے مبحث میں حقیقت نبوت، خواص نبوت، وحی الہام اور معجزات کی حقیقت پر بہت عالمانہ گفت گو فرمائی ہے جو قابل دید ہے۔

شواہد نبوت پر افغانستان کے ایک بزرگ مولانا نورالدین جامی نے ایک کتاب شواہد النبوۃ کے نام سے تحریر کی۔ انہوں نے نبوت کے حوالے سے وہ سب صفات بیان کیں جو رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ میں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے سات ابواب میں شواہد نبوت کو بیان کیا ہے، جن میں شواہد نبوت قبل از ولادت، وقت ولادت، بعثت تا ہجرت، ہجرت تا وصال، بعد از وصال، بہ دست صحابہ کرام، بہ دست تابعین اور شواہد نبوت بہ دست تبع تابعین اور صوفیائے کرام شامل ہیں۔ مولانا جامی چوں کہ ادیب بھی تھے لہٰذا کتاب کا ادبی اعتبار سے بھی پایہ بہت بلند ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود کتاب میں غیر مستند بیانات موجود ہیں۔

سب سے آخری اور جامع ترین کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی خصائص کبریٰ ہے۔ اس میں انہوں نے معجزات کے بارے میں بہت سی معلومات جمع کی ہیں۔ لیکن ان کی کتاب میں بھی بہت سی غیر مستند باتیں جمع ہوگئی ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی اس جلد میں جس میں معجزات کے بارے میں بحث ہے، سیوطی کی تصنیف کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور کم زور روایات کی نشان دہی کی ہے۔ علامہ سیوطی کی یہ کتاب بہت سی کتابوں کا ماخذ رہی ہے۔ اردو اور فارسی میں جتنے میلاد نامے لکھے گئے ہیں ان کی تفصیلات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

دلائل نبوت پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم مضمون سابقہ کتابوں میں آنے والی بشارتیں بھی ہیں۔ اہل کتاب کے صحیفوں میں تو یہ بشارتیں مشہور ہیں، حیران کن امر یہ ہے کہ ہندوؤں کے ویدوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پائی جانے والی خبریں نہ صرف یہ کہ انتہائی درست ہیں بل کہ بڑی تعداد میں آئی ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے۔

معجزات

پیغمبر کی ذات سے معمول سے ہٹ کر ہونے والے خلاف عادت امر کو اسلامی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔(۱۴۱) قرآن میں اس کے لئے بینہ اور آیات کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔معجزے کے ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ معجزہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کی شان کو بڑھانے کا اہتمام ہے اس لئے معجزہ کسی نبی کی نبوت کی اضافی دلیل ہوتا ہے نہ کہ اصولی دلیل جو کہ خود نبی کی اپنی ذات ہے، جس پر اللہ انعام کے طور پر معجزات کا ظہور کرتا ہے۔لہٰذا انبیا کی دعوت میں یہ بات عام تھی کہ وہ اپنی سیرت کو اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے کہ میں نے تم میں راستی کی ایک عمر گزاری ہے میں اللہ پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہوں۔(۱۴۲) یہی وجہ ہے کہ اصول کا انکار کرنے والے اس اضافی دلیل کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لے کر آتے۔جن انبیا کی قوموں پر عذاب آئے انہوں نے یہی کیا تھا کہ معجزے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے تھے۔جب کہ جو لوگ سابقون الاولون میں سے ہوتے ہیں وہ کسی معجزے کا مطالبہ نہیں کرتے بل کہ نبی کے ساتھ اپنی سابقہ رفاقت سے ہی انہیں یقین ہو جاتا ہے۔البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ معجزہ دیکھنے کے بعد ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ ایمان لے آتے ہیں۔لہٰذا معجزہ کچھ لوگوں کے لئے ایمان کی ترقی، کچھ لوگوں کے لئے ایمان کی پہچان اور کچھ لوگوں کے لئے کفر کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔اپنی سیرت کے علاوہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ معجزے کے طور پر پیش کرتے تھے وہ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید تھا۔(۱۴۳) قرآن مجید کس اعتبار سے معجزہ ہے اور اس کے اعجاز کیا ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے۔اگر اسلام کے سب سے بڑے معجزے کا تعین کیا جائے تو وہ قرآن ہی ہے۔یہ تو صرف قرآن کی بات ہے، قرآن کی بنیاد پر قائم ہونے والی شریعت کے بھی اعجاز کچھ کم نہیں۔صرف قانون وراثت کی مثال ہی حیران کن ہے۔وراثت کے حوالے سے قرآن کی صرف تین آیات میں چند بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں۔ان کی بنیاد پر فقہائے اسلام نے اتنے تفصیلی احکام مرتب کئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔(۱۴۴) ان باتوں کی حیثیت عقلی یا علمی معجزات کی ہے، جب کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حسی معجزات کی ایک بہت بڑی تعداد بھی وابستہ ہے۔ان کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں نے بہت سی باتیں کی ہیں۔علامہ سیوطی نے اپنی کتاب خصائص الکبری میں ایک ہزار معجزات کی تفصیل بیان کی ہے۔امام بیہقی بھی ایک ہزار کی تعداد کے قائل ہیں۔امام نووی نے ان کی تعداد ۱۲ سو قرار دی

ہے۔بعض نے تین ہزار اور بعض نے ساڑھے تین ہزار بیان کی ہے۔بعض معجزات کے بارے میں سیرت نگاروں میں اختلاف رہا ہے کہ اسے معجزہ مانا جائے یا نہیں شاید اسی وجہ سے معجزات کی تعداد میں کمی بیشی سامنے آئی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا حسی معجزہ اسرا اور معراج ہے۔

اسرا اور معراج

قرآن پاک میں جس انداز سے سورہ اسرا (بنی اسرائیل) کی ابتدا میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جس زور بیان اور عالی شان انداز سے اس کا آغاز ہوا ہے اس سے خود ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی غیر معمولی بات بیان فرمائی جارہی ہے۔اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جانا اور بڑی بڑی نشانیاں دکھانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی خواب یا منام کی کیفیت نہیں بل کہ ایسی غیر معمولی چیز ہے جو دوسرے انسانوں کو پیش نہیں آئی۔لہٰذا حضرت عائشہؓ کی اس روایت کی جس میں کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم زمین پر موجود رہا۔توجیہ سیرت نگاروں نے اور طرح سے کی جس سے یہ موضوع کلام کا موضوع بن گیا۔اس پر یہ نقطہ نظر اختیار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم یہاں موجود رہا اور ان کی روح کو لے جایا گیا۔(۱۴۵) لہٰذا یہ خواب سے ایک مختلف چیز تھی۔اگر یہ محض خواب ہوتا تو کفار مکہ کی طرف سے اس کی تردید کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ہر کوئی خواب دیکھتا ہے اور کوئی بھی کسی کے خواب کی تردید نہیں کرتا کہ فلاں چیز دیکھی اور فلاں چیز نہیں دیکھی۔مزید برآں صدیق کے لقب کی معنویت اس وقت تک اس اہمیت کی حامل قرار نہیں دی جاسکتی جب تک کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی تصدیق عام انسانوں کے لئے آسان نہ ہو اور خالص ایمان یقین کی بہ جائے محض عقل کی بنیاد پر جس کی تصدیق کی جاسکتی ہو۔

اسرا کی ایک تعبیر امام جعفر الصادق سے منسوب ہے جس میں وہ مسجد اقصیٰ سے مراد یروشلم والی مسجد مراد نہیں لیتے، جیسا کہ عام طور پر تسلیم شدہ بات ہے بل کہ اس سے وہ آسمانوں میں موجود بیت المعمور مراد لیتے ہیں جس کے لئے بہت سی توجیہات ہیں۔اولاً قرآن ایک بہت فصیح اور بلیغ کتاب ہے جس کا تقاضا اور خوبی یہ بھی ہے کہ اگر دو کارناموں کا ذکر ہو اور اس میں چھوٹے کارنامے کا تذکرہ کر کے اصل کارنامہ چھوڑ دیا جائے تو یہ بلاغت نہیں۔بیت المقدس تک راتوں تات جانا ایک بڑا معجزہ لیکن آسمانوں کی سیر کے مقابلے میں اس کی حیثیت بہت کم ہے جس کے ذکر کو چھوڑ دیا گیا۔لہٰذا لازمی ہے کہ اس مسجد سے مراد بیت المعمور ہے اور یہ معجزہ دراصل معراج ہی ہے جس کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ثانیاً قرآن میں روم کو ادنی

الارض کہا گیا ہے یعنی قریب کا علاقہ جب کہ یروشلم اس سے نزدیک ہے لیکن اسے دور کی مسجد (اقصی بہ معنی دور) کہا گیا۔ لہٰذا یہاں اقصی سے مراد بیت المعمور ہے۔ ثالثاً قرآن کا جو بیان ہے الذی بارکنا حولہ یعنی جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ بیت المقدس پر اس وقت مشرکین کا قبضہ تھا اور شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اس لئے اس پر بابرکت ماحول کی بات صادق نہیں آتی۔ لامحالہ یہ اشارہ بھی بیت المعمور کی طرف ہی جاتا ہے۔

اسرا اور معراج کے موضوع پر مسلمانوں میں طویل عرصے سے غور وخوض اور گفت گو کا عمل جاری ہے۔ اس پر ہر پہلو سے لکھا گیا ہے حتی کہ ادبی حوالے سے بھی اس پر لکھا گیا اور اس میں برصغیر کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ یہ بات کہ کائنات کے مختلف حصوں کا ایک روحانی اور تصوراتی سفر معراج کے واقعے سے متاثر ہو کر کیا جائے اور اس سفر کی داستان میں ادبی علامتوں اور رمز کے انداز میں مختلف حقائق کو بیان کیا جائے۔ اس کا سب سے آخری اور برصغیر کا انتہائی ممتاز اور قابل فخر نمونہ علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ ہے۔ اس میں انہوں نے سیارگان فلک کا ایک روحانی اور تصوراتی سفر مولانا روم کی معیت میں کیا اور مختلف تاریخی شخصیات سے تصوراتی ملاقاتیں کیں۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کی شخصیات شامل ہیں۔ ان کی زبان سے مختلف حقائق بیان فرمائے اور یوں یہ کتاب علامہ اقبال کے فکر وفلسفے اور ادبیات کے ایک انتہائی اعلیٰ اور منفرد نمونے کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔

دیگر معجزات

دیگر معجزات میں ایک اہم معجزہ شق قمر کا ہے جس کا ذکر حدیث کے علاوہ قرآن میں بھی آیا ہے یعنی اقتربت الساعۃ وانشق القمر (سورہ القمر)۔ اس کے علاوہ باقی اکثر وبیش تر معجزات کا ذکر حدیث میں ملتا ہے اور یہ احادیث استناد کے اونچے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک بڑا معجزہ مستجاب الدعا ہونا تھا۔ یہ بات آپ ﷺ کے دشمن بھی جانتے تھے۔ ایک مرتبہ عتبہ بن ولید قریش کی طرف سے آپ ﷺ سے بات چیت کرنے آیا جس کے جواب میں آپ نے سورہ حم السجدہ کی آیات پڑھیں، جن کا مفہوم تھا کہ اگر یہ لوگ ماننے سے انکار کریں تو ان سے کہہ دیں کہ تمہیں اس طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں جس عاد وثمود کو تباہ کیا گیا۔ یہ سننا تھا کہ عتبہ نے آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ بھتیجے ایسا نہ کہو کیوں کہ تم جو کہتے ہو وہ ہو جاتا ہے۔ ایک اور مثال کسری ایران کی ہے جس نے آپ ﷺ کا نامہ

مبارک چاک کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر فرمایا تھا کہ اللہ اس کی سلطنت کو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔ یہ بات پوری ہوتی ساری دنیا نے دیکھی کہ دس سال کے قلیل عرصے میں ساسانی سلطنت کا نام ونشان مٹ گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جب مکہ سے ہجرت کرکے آئے تو سارا سامان وہیں چھوڑ آئے۔ یہاں آکر خالی ہاتھ تجارت شروع کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے برکت کی دعا کی۔ اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ خود کہتے ہیں کہ میں پتھر بھی ہٹاتا تو گمان ہونے لگتا کہ یہاں سے سونا برآمد ہوگا۔ صحابہ کرامؓ ان کو اپنے پیسے دیتے کہ کاروبار میں لگائیں کیوں کہ جتنا نفع ان کو ہوتا تھا کسی اور کو نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ صرف تین سال رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رہے۔ ان کے لئے رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے علم اور دین میں تفقہ کی دعا فرمائی۔ (۱۴۶) انہیں صحابہ کرامؓ میں یہ حیثیت حاصل تھی کہ بڑے بڑے صحابہ فہم دین میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آج قرآن، حدیث، فقہ، سیرت اور کلام، عقیدہ، عربی ادب، عربی زبان کی نزاکتیں، غرض اس زمانے کے علوم وفنون میں کوئی ایسا فن نہیں ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس سند کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ ایک مرتبہ قحط سالی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے دعا کی درخواست کی گئی تو آپ ﷺ کی دعا سے اتنی بارش ہوئی کہ پھر بارش رکوانے کے لئے دعا کی درخواست کی گئی جس سے بارش بند ہوگئی۔ (۱۴۷)

معجزات کے ضمن میں ایک اور تقسیم آپ ﷺ کی پیشین گوئیوں کی ہے جو بے شمار ہیں۔ غزوہ خندق کے دوران آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ جب یہ قیصر ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا اور جب یہ کسری ہلاک ہوجائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔ چناں چہ آج تک رومیوں کے عرب مقبوضات میں قیصر اور ایران میں کوئی کسریٰ نہیں آیا اور یہ دونوں علاقے سو فیصد مسلمان ہوگئے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے استنبول کی فتح کے بارے میں بھی پیشین گوئی فرمائی کہ تم قیصر کے دارالحکومت کو لازماً فتح کروگے (اس وقت قسطنطنیہ یعنی استنبول بازنطینی سلطنت کا پایہ تخت تھا) وہ سردار کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا اور وہ لشکر کتنا اچھا ہوگا جو اس کو فتح کرے گا۔ (۱۴۸) ۱۴۵۳ء میں اسے عثمانی سلطان محمد الفاتح نے فتح کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے معجزات کی ایک قسم ان واقعات پر مبنی ہے جن میں نباتات وجمادات نے آپ ﷺ کی نبوت کی گواہی دی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ فلاں چٹان کے نزدیک یہ واقعہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں اس چٹان کو جانتا ہوں وہ نبوت سے

پہلے مجھے سلام کیا کرتی تھی۔ اسطوانہ حنانہ ایک کھجور کا خشک تنا تھا جس سے ٹیک لگا کر رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب منبر بن گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ ٹیک لگا چھوڑ دیا جس پر اس سے رونے کی آواز برآمد ہوئی جیسے کوئی بچی لے کر روتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تھپکی دی تو وہ ایسے چپ ہوگیا جیسے بچہ دلاسا دینے سے چپ ہوگیا ہو۔ یہ جگہ آج بھی مسجد نبوی کا حصہ ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ احد پہاڑ پر تشریف فرما تھے کہ پہاڑ ہلنے لگا۔ آپ ﷺ نے قدم مبارک زمین پر مارا اور فرمایا ٹھہر جا تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور ایک شہید کھڑے ہیں۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک بدو نے آپ ﷺ کی نبوت کا ثبوت ایک درخت سے چاہا تو آپ ﷺ نے درخت کو حکم دیا کہ اللہ کے حضور سجدہ کرو تو وہ درخت قریب آیا اور اس نے سجدہ کیا۔ جب آپ ﷺ نے اسے واپس جانے کو کہا تو وہ درخت اپنی جگہ پر چلا گیا۔ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے پاس ایک از کار رفتہ گھوڑا تھا جسے کوئی خریدنے والا نہ تھا جب کہ اسے مارڈالنا بھی ان کے لئے تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے رسول اللہ سے اس بابت پوچھا تو آپ ﷺ نے گھوڑا طلب فرمایا اسے نکیل ڈالی اور سوار ہو کر نکل پڑے۔ واپس آئے تو وہ گھوڑا مدینے کے تیز رفتار گھوڑوں میں سے ایک بن چکا تھا اور اس کا لقب بحر پڑ گیا۔

ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا سے پانی اور کھانے کی کثرت ہوگئی اور تھوڑی سی خوراک ہزاروں آدمیوں کے لئے کافی ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوہریرہؓ کو ایک توشہ دان دیا تھا جس میں کھجوریں تھیں۔ جب بھی انہیں ضرورت پڑتی وہ اسے میں سے کھجوریں نکال کر کھا لیتے لیکن ختم نہ ہوتیں۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک حضرت ابوہریرہؓ اس توشہ دان سے کھجوریں کھاتے رہے۔ شہادت عثمان کے ہنگامے میں وہ توشہ دان کھو گیا تو حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے لوگوں کو ایک غم ہے یعنی شہادت عثمان کا لیکن مجھے دو غم ہیں۔ ابوہریرہؓ سے ہی مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کئی روز فاقے سے تھے کہ کہیں سے دودھ کا ایک پیالہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ اصحاب صفہ کو بلا لاؤ اور انہیں پلانا شروع کرو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے سوچا کہ مجھے کیا ملے گا لیکن اس پیالے میں سے سب نے سیر ہو کر پیا تو پھر بھی دودھ ویسے ہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوہریرہؓ سے پینے کو کہا حتیٰ کہ وہ مزید پینے کے قابل نہ رہے تو رسول اللہ ﷺ نے پی کر پیالہ خالی کر دیا۔

غزوہ خندق کے موقع پر رسول اکرم ﷺ اور صحابہ بہت دنوں سے فاقے سے تھے کہ حضرت جابرؓ

نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کرنا چاہی۔ ان کے پاس بکری کا ایک بچہ تھا جو انہوں نے ذبح کرلیا اور رسول اللہ ﷺ کو دعوت کا پیغام دیا۔ رسول اللہ نے سن کر تمام صحابہ سے کہا کہ جابر کے ہاں تمہاری دعوت ہے۔ اس پر جابرؓ پریشان ہوئے کہ اتنے لوگوں کا کھانا نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ سے کہا کہ بیوی سے کہو سالن کو ڈھک دے اور روٹیاں پکاتی جائے۔ اس طرح سے تمام صحابہؓ نے کھانا کھالیا لیکن سالن اور آٹا ختم نہ ہوا۔ آخر میں رسول اللہ ﷺ نے تمام اہل خانہ کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اس کے علاوہ غزوات میں بھی اس طرح کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

کلامیات سیرت کے حوالے سے آخری بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ بعض مسئلے جو پہلے صرف تاریخی اہمیت کے حامل تھے بعد میں کلامی بن گئے۔ اس سلسلے میں وہ مسائل زیادہ اہم ہیں جو جدیدیت کے آغاز سے اہل مغرب نے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے حوالے سے پیدا کئے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی تعدد ازواج کا مسئلہ وغیرہ۔ بعض مسائل رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت کے باعث کلامی بن گئے۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے ایمان کا مسئلہ۔ کیوں کہ انہوں نے آپ ﷺ کا بہت ساتھ دیا تھا لہٰذا بعض حضرات ان کو غیر مسلم تسلیم کرنے کو روا نہ رکھ سکے اور اس پر بحث وتمحیص کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے والدین کے ایمان کا مسئلہ اس سے بھی شدت کے ساتھ کلام کا محور بنا۔ مسائل کو کلامی بنانے کے رجحان کی مثال سیرت ابن ہشام کے شرح روض الانف ہے، جو علامہ سہیلی نے تحریر کی۔ سیرت ابن ہشام خالصتاً واقعات کی کتاب ہے، لیکن علامہ سہیلی نے جا بہ جا اس میں کلامی مسائل اٹھا دیئے جیسے روح اور نفس کی بحث، اسرا اور معراج کا واقعہ وغیرہ۔

باب نہم: فقہیات سیرت

گزشتہ موضوع کی طرح سیرت کا یہ پہلو بھی دوہری نوعیت کا ہے۔ اس طرح سے کہ فقہا کو فقہ مرتب کرنے میں لامحالہ سیرت کی رہ نمائی کی ضرورت تھی جب کہ دوسری طرف سیرت نگاروں نے سیرت کو مرتب کرتے ہوئے فقہی مباحث کو بھی اپنے کام میں شامل کیا۔ لہٰذا موخر الذکر پہلو فقہیات سیرت کا اصل نفس مضمون ہے۔ تاریخی حوالے سے پہلے باب میں یہ بیان ہو چکا کہ فقہ کا آغاز سیرت کو قانونی حوالے سے مرتب کرنے سے ہوا جسے سیر کہا جاتا تھا اور بعد میں وہ باقاعدہ مضمون کی شکل اختیار کر گیا۔ اس

حوالے سے سیرت اور فقہ کا انتہائی گہرا تعلق ہے، کیوں کہ ثانی الذکر اول الذکر کی ذیلی شاخ کے طور پر سامنے آیا۔ ایک اعتبار سے سیرت کی عملی تطبیق کا نام فقہ ہے اور فقہ سیرت ہی کی گہری فہم کا نام ہے۔ بہ ہر حال اسلام کے روایتی دور میں یہ دونوں الگ مضامین کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے تھے اور اپنی ابتدائی حیثیت سے نہیں جانے جاتے تھے۔ ان دونوں میں تداخل کا دوبارہ رجحان جدید دور کے آغاز میں ہوا جب فقہ السیرہ کے نام سے سیرت کا نیا اسلوب سامنے آیا جس کا تذکرہ آئندہ کے کسی باب میں آئے گا۔

فقہیات سیرت کی دوہری نوعیت کے پیش نظر اسے کئی پہلوؤں سے زیر بحث لایا جاسکتا ہے لیکن سیرت کو پیش نظر رکھیں تو اس کا اصل محور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور احوال کی مختلف حیثیتوں اور درجوں کو متعین کرنا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح سے ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ترجمان تھے اور آیت وما ینطق عن الھوی کی رو سے آپ ﷺ وحی کے علاوہ کچھ نہیں فرماتے تھے۔ لیکن یہ بات شریعت کے تناظر میں ہے اور تمام معاملات تک محیط نہیں۔ اسی چیز کو طے کرنا کہ رسول اللہ کا کون سا قول وعمل حکم شرعی ہے اور کون سا از راہ طبع کے ہے فقہ السیرہ کا نفس مضمون بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس امر کا تعین کرنا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی بات کس زاویہ نگاہ سے فرمائی، کیوں کہ آپ ﷺ کا ہر قول کسی نہ کسی زاویے سے شریعت ہی کے ضمن میں آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے جتنے پہلو تھے اتنے زاویہ نگاہ سامنے رکھنے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے بہ حیثیت پیغمبر، بہ حیثیت سربراہ ریاست، بہ حیثیت معلم، بہ حیثیت فرد خانہ، بہ حیثیت سپہ سالار اور بہ حیثیت قاضی کے ہدایات جاری فرمائیں۔ لہٰذا جس حیثیت سے کوئی بات فرمائی تو اس کے تضمنات دوسری حیثیت سے فرمائی گئی بات کے تضمنات سے مختلف ہوں گے، لہٰذا اس ارشاد یا قول پر قائم ہونے والا شرعی یا فقہی مسئلہ بھی اپنے حکم میں منفرد ہوگا۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو بحث موضوع سے متعلق ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ اجتہاد بھی کرتے تھے؟ اس پر اختلاف ہے کہ آپ ﷺ چوں کہ صاحب وحی تھے لہٰذا آپ کو اجتہاد کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کہ دوسری رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ واضح حکم نہ ہونے کی صورت میں ایسا کرتے تھے۔ چوں کہ آپ ﷺ کا اجتہاد مامون ومحفوظ ہوتا تھا، اس لئے وہ وحی کے ہی مصداق تھا۔ بہت کم ایسا ہوا کہ آپ ﷺ کے اجتہاد سے مختلف حکم قرآن میں وارد ہوا ہو۔ اکثر وبیش تر آپ ﷺ کا اجتہاد ہی قرآن میں حکم بن کے آیا۔ اس اجتہاد کے لئے اہل علم نے ملکہ نبوت، فہم نبوی اور فہم رسالت کی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ اس پہلو

کی تفصیل فقہ السیرہ کے موضوع کو پھیلانے اور اسے ایک الگ مضمون کے سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

فقہ السیرہ کی بنیاد جس چیز سے پڑی وہ عہد رسالت کا ہی ایک واقعہ ہے۔ مکے میں زراعت نہیں تھی جب کہ مدینے زراعت کا مرکز تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے آئے تو دیکھا کہ جو لوگ کھجور اگاتے ہین وہ اس کے پودوں میں نر اور مادہ کی بنا پر قلم لگاتے ہیں۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ کو اس سے ناگواری ہوئی جس کے باعث صحابہؓ نے یہ عمل چھوڑ دیا۔ اس سے پیداوار متاثر ہوئی۔ جن کی پیداوار متاثر ہوئی انہوں نے احتراماً یہ بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان نہیں کی۔ (۱۴۹) بعض نوجوان صحابہ نے جرأت کر کے رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے آگاہ کیا۔ رسول اللہ نے بزرگ صحابہ سے اس مسئلے کو دریافت کیا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: انتم اعلم بامور دنیاکم کہ تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ جب میں شریعت یا دین کو کوئی بات تم سے کہوں تو وہ تمہارے لئے واجب التعمیل ہے۔ (۱۵۰) اس بات پر محدثین اور فقہا کے ہاں بڑی لمبی لمبی بحثیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال کا تعین کس طرح سے کیا جائے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی بنیاد پر فقہا میں فرض، واجب، سنت، مستحب، مکروہ وغیرہ کی اصطلاحات وضع ہوئیں۔ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کے اقوال تین قسم کے معاملات سے متعلق ہدایات فراہم کرتے ہیں۔ وہ باتیں جو آپ ﷺ نے بہ طور شرعی ہدایت کے ارشاد فرمائیں۔ ان میں عقائد، مکارم اخلاق، عبادات اور حلال وحرام شامل ہیں۔ دوسرا دائرہ انسانوں کا رہن سہن اور کھانے پینے کے آداب ہیں جب کہ تیسری چیز انسانوں کے باہمی معاملات ہیں جن میں لین دین اور تجارت قابل ذکر ہیں۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی تین حیثیتوں سے اپنے ارشادات صادر فرمائے۔ بہ طور نبی، بہ طور قاضی اور بہ طور سربراہ ریاست۔ (۱۵۱) بہ طور نبی آپ ﷺ نے کلام اللہ کی تشریح فرمائی ہے اور آپ ﷺ نے گورنروں کی تقرری وغیرہ کے احکامات صادر فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی نوعیت کے تعین کے لئے ایک امدادی چیز اس وقت کا محاورہ تھا جو کہی گئی بات کے تناظر کو جاننے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا کہ احل لکم طیبات ''تمہارے لئے طیب چیزیں حلال کردی گئی ہیں'' تو اس کے لئے عرب کے محاورے کو جانچنا ہوگا کہ عرب کن چیزوں کو طیب کہتے تھے۔ پھر اس کو بنیاد بناتے ہوئے باقی دنیا میں طیب چیزوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ان معاملات کے حوالے سے اصطلاحات کو متعین کرنے کے لئے فقہا نے جس چیز کو پیش نظر رکھا اسے حکمت تشریع کہتے ہیں، یعنی شریعت کے نفاذ میں جس کا عملی مظاہرہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کیا کون سی حکمتیں کارفرما تھیں۔ حکمت تشریع کو جدید قانون سازی کی زبان میں meta jurisprudence کا نام دیا جاسکتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قانون سازی jurisprudence میں کون سی فکری بنیادیں کارفرما ہیں۔ (۱۵۲) آسان الفاظ میں حکمت تشریع قانون کی بنیاد در بنیاد ہے۔ حکمت تشریع کے اصولوں کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کو بہ جا طور پر بنی نوع انسان کا مقنن اعظم کہا جاسکتا ہے۔ یہ وجہ ہے آپ اصولوں کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کے مختلف ارشادات وافعال کے مقام کا تعین ممکن ہوا اور یہ کام فقہا اسلام نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کو بہ جا طور پر بنی نوع انسان کا مقنن اعظم کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے معجزات میں خود آپ ﷺ کی شریعت بھی ہے جو اپنے ربط، نظم، تناسق اور تکامل کے اعتبار سے دنیا کے نظاموں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

حکمت تشریع کے حوالے سے بہت سی باتیں ہمیں سیرت کے مطالعے سے ملتی ہیں۔ (۱۵۳) ان میں اہم ترین بات یہ تھی کہ معاشرت اور معیشت کے وہ امور جو شریعت کے اصول سے متصادم نہیں تھے ان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس میں مکارم اخلاق کا اتمام ایک واضح ہدایت تھی کہ ایسے احسن امور جن پر بنی نوع انسان اسلام سے پہلے عمل کرتے تھے یا اسلام کے آجانے کے بعد کسی انسانی گروہ نے رویوں میں عمدگی پیدا کرلی تو انہیں اس وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جائے گا کہ ان اسلام کے ساتھ بہ راہ راست کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ان کی عمدگی ان کے اسلام سے تعلق کی دلیل ہے۔ (۱۵۴) یہ مکارم اخلاق کے اتمام کا اصل مفہوم ہے۔ اسی ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی وہ ہدایت ہے کہ لوگوں کو خوش خبری دو اور انہیں متنفر نہ کرو۔ ان کے لئے آسانی پیدا کرو اور مشکل میں مت ڈالو۔ (۱۵۵) یعنی مفتوح اقوام کے وہ معاملات جو شریعت سے متصادم نہیں انہیں کسی علاقائی، نسلی یا لسانی تعصب کی بنا پر پابندی کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ (۱۵۶)

اصول قانون یا meta jurisprudence کی رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف بنیاد رکھی بل کہ اس فکر کو صحابہؓ کے ذہنوں میں راسخ کیا اور حقیقت میں مکہ کے تیرہ سال اسی کاوش میں گزرے کہ اسلام قبول کرنے والے بھی حکمت تشریعی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے سترہ آیات ایسی ہیں جو حضرت عمرؓ کے فہم کے مطابق نازل ہوئیں۔ اسی طرح دیگر صحابہؓ کے حوالے سے بھی قرآن کے

نزول کی مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن کے احکامات کا تدریجاً نازل ہونا (۱۵۷) اور کسی قوم کو کسی برائی سے ہٹانے کے لئے پہلے اس برائی سے منسلک چیزوں کو ختم کرنے کا رجحان اسی حکمت تشریع کی فہم پیدا کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ (۱۵۸)

حکمت تشریع کی ایک اور اہم بات معاملات کو ترجیحی بنیادوں پر طے کرنا ہے۔ یعنی اس چیز کو پیش نظر رکھنا کہ کون سی چیز بنیادی ہے اور کون سی ثانوی۔ پہلے بنیادی اہداف و مقاصد پر توجہ دی جائے گی اور اس کے بعد دوسرے معاملے کو دیکھا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں مندوبات اور مباحات میں تعارض آجائے تو مندوبات کو پہلے طے کیا جائے گا اور مباحات کو بعد میں دیکھا جائے گا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مندوبات کے اثر کو قائم رکھنے کے لئے مباحات سے اعراض برت لیا جائے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خانہ کعبہ کی تعمیر تھی۔ قریش نے جب اسے تعمیر کیا تو اخراجات کی کمی کے باعث وہ حصہ تعمیر ہونا رہ گیا جسے حطیم کہا جاتا ہے، جب کہ اس سے قبل حطیم بھی باقاعدہ دیواروں اور چھت پر مشتمل تھا جس کے باعث کعبے کی ایک دیوار بیضوی تھی۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہاری قوم اسلام میں نئی نئی داخل نہ ہوئی ہوتی اور مجھے خطرہ نہ ہوتا کہ یہ اسلام سے پھر جائے گی تو میں کعبے کی عمارت کو ڈھا کر دوبارہ حضرت ابراہیمؑ کی دیواروں پر استوار کر دیتا۔ (۱۵۹) اس سے اندازہ ہوا کہ قومی عصبیت کو ہوا ملنے کے خطرے کے پیش نظر خانہ کعبہ کو اصل بنیادوں پر لانے جیسے اہم کام کو چھوڑ دیا گیا، کیوں کہ اصل مقصد اس کا طواف تھا بہ خوبی پورا ہو رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے اقوال و ارشادات کی حیثیت کا تعین سیرت نگاری کا ایک منہج اور اسلوب ہے لیکن فقہ کا منہج اور اسلوب زیادہ دقیق ہوتا ہے، لہٰذا وہاں اختلاف کی گنجائش بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف لوگوں کا اقوال رسول کو درجات میں تقسیم کرنا فقہ کی تفصیلات میں حتمی ثابت نہ ہوسکا اور کسی خاص مسئلے پر مختلف فقہوں میں اختلاف اس مسئلے پر رسول اللہ ﷺ کے قول کی حیثیت کو مختلف انداز میں لینے سے ہوا۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جو کسی غیر آباد زمین کو آباد کرلے گا وہ اس کی ملکیت ہوگی، (۱۶۰) امام شافعی اور امام مالکؒ نے اس حدیث کو شرعی حکم کے مترادف سمجھا ہے، لہٰذا جب بھی کوئی شخص کسی زمین کو آباد کرے گا تو وہ اس کی ملکیت شمار ہوگی۔ جب کہ امام ابوحنیفہؒ اس حکم کو رسول اللہ ﷺ کا ریاستی معاملہ قرار دیتے ہیں جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق جاری کیا گیا۔ لہٰذا یہ اختیار ایک حکومت کے پاس ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے شہریوں کو ایسا کرنے کی اجازت دے وگرنہ یہ حکم عام

نہیں ۔ امام ابوحنیفہ کے اس فیصلے پر مالکی اور شافعی حضرات کے ہاں بہت تنقید پائی جاتی ہے لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ جن ملکوں میں فقہ مالکی یا فقہ شافعی نافذ ہے وہاں بھی حکومت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ عام شہری اس حق کو استعمال کرسکیں ۔ اسی طرح جنگ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی کسی دشمن کو قتل کرے گا تو دشمن کے سامان کا حق دار ہوگا ۔ یہاں بھی امام ابوحنیفہؒ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ حکم بہ طور سربراہ حکومت کے تھا لہٰذا اس وقت کی مناسبت سے تھا اور اگر میں اس پر عمل ہوگا تو حکومت کی اجازت سے ہوسکتا ہے ۔ جب کہ امام شافعی یہاں بھی اسے حکم شرعی کے مصداق ٹھہراتے ہیں ۔ جب کہ امام مالکؒ کی رائے امام ابوحنیفہؒ کے موافق ہے ۔ (۱۶۱)

فتح مکہ کے موقع پر ایک اور بات سامنے آئی کہ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کی ملکیت کو نکال کر اپنے ملک لے جانے میں کام یاب ہوجائے یا اگر دشمن مسلمانوں کی املاک پر قابض ہوجائے تو اس پر سے مسلمانوں کا حق ختم ہوجائے گا اور جب کبھی مسلمان اسے دوبارہ فتح کریں گے تو ان املاک کا حکم مفتوح علاقوں کی املاک کے مترادف ہوگا ۔ اس کی دلیل فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کا اپنی ان جائیدادوں پر کوئی دعویٰ قائم نہ کرنا تھا ، جن پر ہجرت کے بعد قریش نے قبضہ کرلیا تھا ۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود رسول اللہ ﷺ کا مکان تھا جسے انہوں نے واپس نہیں لیا ۔ یہ استدلال بھی امام ابوحنیفہؒ کا ہے جب کہ بقیہ فقہا اس سے اتفاق نہیں کرتے ۔ اس اصول کو احراز کا اصول کہا جاتا ہے ۔ البتہ فتح اور معاہدے کی صورت میں اسلامی قلم رو میں شامل ہونے والے علاقوں کے احکامات مختلف ہوں گے ، جیسا کہ سیرت کے واقعات اس پر دلالت کرتے ہیں ۔ مکے کی فتح کے بارے میں یہ اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ وہ فتح ہوا تھا یا صلح کے تحت مسلمانوں کے زیر نگین آیا ۔ دونوں طرف کے نقطہ ہائے نظر دونوں صورتوں کے حوالے سے مختلف احکامات مرتب کرتے ہیں ۔ (۱۶۲)

باب دہم : مطالعہ سیرت پاک و ہند میں

برصغیر میں جس کے لئے موزوں ترکیب برعظیم ہے (۱۶۳) سیرت پر کما حقہ کام ہوا ہے ۔ گوازمنہ وسطیٰ کے برعظیم (۱۶۴) کے تقریباً سارے عہد میں نہ صرف سیرت بل کہ قرآن وحدیث کی نشر واشاعت سے بھی اعراض برتا گیا لیکن دور جدید کے آغاز سے اس خطے کے اہل علم نے سیرت پر جس قدر کام کیا وہ پوری دنیا کے لئے قابل رشک حیثیت اختیار کرگیا ۔ (۱۶۵) سیرت اور دیگر علوم اسلامی پر کام کے حوالے

سے برعظیم کے دور کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور عربوں کا ہے جس میں سندھ اور اس سے ملحقہ علاقے فتح ہوئے۔ دوسرا دور ترک حملہ آوروں کا ہے جو سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے ادوار پر مشتمل ہے۔ تیسرا دور متاخرین مغل کا ہے جس میں مثلاً حکومت انگریزوں کی تھی۔ چوتھا دور جنگ آزادی کے بعد کا ہے جب انگریزوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوچکی تھی۔ اور آخری دور بیسویں صدی کا نصف اول ہے جس تذکرہ اگلے باب میں ہوگا۔ اس باب میں پہلے چار ادوار کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

برعظیم میں چوں کہ سب سے پہلے سندھ فتح ہوا لہٰذا یہاں کے لوگوں کے عرب سے روابط قائم ہوئے جس سے یہاں کا جوہر نکھر کر سامنے آیا اور یہاں کے اہل علم نے عرب دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ البتہ اس عہد میں جو بھی کام ہوا وہ عربی زبان میں ہوا۔ دوسرا یہ کہ یہاں کہ اکثر وبیش تر اہل علم نے عرب دنیا کو ہی اپنا مستقر بنالیا اور سندھ میں نہیں رہے۔ ان میں سے ایک نام ور عالم ابومعشر نجیح السندی ہیں جن کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا۔ ان کی بیان کردہ روایات مختلف کتابوں میں ملتی ہیں، ان کی اپنی کوئی کتاب موجود نہیں۔ ایک اور بڑا نام امام اہل الشام عبدالرحمٰن الاوزاعی (م ۱۵۷ھ) کا ہے جو امام ابوحنیفہ کے معاصر تھے۔ دونوں نے اسلام کے بین الاقوامی قانون یعنی علم سیر کو اپنی دل چسپی کا موضوع بنایا۔ امام اوزاعی بھی سندھ سے عرب جا کر بس گئے تھے اور بیروت کو اپنا مسکن بنالیا۔ امام اوزاعی کی اپنی کتاب سیر الاوزاعی موجود ہے جس کا رد امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابویوسف نے **الرد لسیر الاوزاعی** کے نام سے لکھا ہے۔

سندھ میں ٹھٹہ کا علاقہ سیرت اور دیگر علوم کے حوالے سے بہت اہم رہا ہے۔ جب مسلم حکومت کا مرکز شمال ہند منتقل ہوگیا تو پھر بھی ٹھٹہ کے اہل علم سندھ کی علمی تاریخ کا بہت اہم اور درخشاں باب رہے۔ سیرت کے موضوع پر ٹھٹہ کے مخدوم محمد ہاشم نے ایک کتاب لکھی جو عرب دنیا میں بہت مقبول ہوئی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی پوری سیرت کو سامنے رکھ کر ایک ایسا نقشہ مرتب کیا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ پورے سال کے بارہ مہینوں کے باون ہفتوں اور ۳۵۴ دنوں میں رسول اللہ ﷺ کے معمولات کیا ہوتے تھے۔ اس کا اردو ترجمہ 'عہد نبوی کے ماہ وسال کے نام سے دست یاب ہے۔ ان کے علاوہ ایک نام علامہ ابوالحسن سندھی کا ہے جو ٹھٹہ ہی کے رہنے والے تھے۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صحاح کی تمام کتابوں کی شرح لکھی۔ ان کے علاوہ یہ شرف صرف امام سیوطی کو حاصل ہے۔ سندھ کے اہل علم چوں کہ زیادہ تر عرب جا کر آباد ہوگئے تھے اس لئے ان پر زیادہ کتابیں عرب ہی میں شائع ہوئیں۔ سندھ کے ایک

عالم شیخ محمد عابد پر مکے کے ایک فاضل نے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ بقیہ اہل علم کی طرح شیخ محمد عابد کا نام بھی صرف عرب دنیا میں معروف ہے۔

عرب خلافت کے زوال پذیر ہونے سے ایران اور وسط ایشیا کی مسلم سلطنتوں کو عروج حاصل ہوا لہٰذا محمود غزنوی کے بعد سے لے کر انگریزوں کی آمد تک برعظیم کا مسلم عہد ترک اور ایرانی نژاد حکم رانوں کا عرصہ حکومت قرار پایا۔ لہٰذا اس طویل عہد میں ہندوستان کی علمی روایات پر وسط ایشیائی اور ایرانی اثرات غالب رہے۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ ان روایات کے زیر اثر قرآن، حدیث اور سیرت کے مضامین نظر انداز ہوئے۔ (۱۶۶) زیادہ تر کلامی مضامین کو عروج حاصل ہوا اور نصاب میں تمام تر توجہ عربی زبان کی صرفی ونحوی بحثوں کی نظر ہو جایا کرتی تھی۔ بہت سے حضرات کی دل چسپی عربی زبان وقواعد کے صرف اس پہلو پر رہی جس کا تعلق لفظی چیستانوں اور صرفی نحوی بازی گری سے ہے۔ صرف ونحو کی وہ کتابیں جو صرف ونحو تو نہیں سکھاتیں لیکن لفظی بازی گری میں طلبہ کو ضرور طاق کر دیتی ہیں وہ برعظیم میں خوب رائج رہیں اور ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کی علمی روایت کی انتہا یہی سمجھی گئی کہ کس نے کتنے متون یاد کئے ہیں، کتنے حاشیے اور کتنے حاشیوں کی ذیلی حواشی یاد ہیں وغیرہ۔ (۱۶۷) یعنی اس نظام تعلیم میں یہ مطمح نظر نہیں تھا کہ قرآن کا آفاقی پیغام کیا ہے اور اسے لے کر دنیا میں کیسے پھیلانا ہے۔ دور سلاطین کے اس رجحان کو مغلیہ عہد کے اہل علم ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور مغلیہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان میں فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں حکیم فتح اللہ خان شیرازی کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے دور متاخر کے فلسفے اور عقلیات کے بہت سے مباحث یہاں کے تعلیمی نصاب میں متعارف کروائے۔ جہاں پہلے صرف نحوی بحثیں ہوتی تھیں اب وہاں فلسفہ اور عقلیات بھی بال کی کھال اتارنے لگے۔ اس پر مستزاد ٹھہرے صوفیا کے شطحیات جو بہ قول مجدد الف ثانی انہوں نے اپنی وجدانی غلطیوں سے قائم کر لئے تھے۔ متاخر صوفیا نے مسلمانوں میں بھگتی تحریک (۱۶۸) کو مقبول بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہند کے مسلمانوں میں ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے یہ تک کہہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا دین نعوذ باللہ ایک ہزار سال کے لئے آیا تھا۔ (۱۶۹) اور اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ اسے عروج اس لئے حاصل ہوا کہ اس نظریے کو اکبر بادشاہ کی سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ اس طرح کی مثال دنیائے اسلام کے کسی اور عہد تاریخ میں نہیں دی جا سکتی، اور یہ تمام تر نتیجہ تھا قرآن وحدیث کے اصل پیغام سے اعراض برتنے کا۔

اس ماحول میں جب کہ اکبر کے قائم کردہ عبادت خانے کی بحثوں میں شریعت کا مذاق اڑایا جارہا تھا، برعظیم میں دو بزرگوں نے اصلاح احوال کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ تھے شیخ احمد سرہندیؒ اور عبدالحق محدث دہلویؒ۔ دوسرے مجوزہ دور میں جو سب سے طویل ہے، یہی دو شخصیات ہیں جنہوں نے سیرت کے حوالے سے کام کیا۔ ہزار سالہ دور کی نسبت سے جہاں دگر اعتقادوں نے ایک نئے دین کی ضرورت کی بات کر کے الفی تحریک کا آغاز کیا وہاں راسخ الاعتقادوں نے دین کے احیا کی بات کی، اسی لئے شیخ احمد سرہندی کو دوسرے ہزار سال کے آغاز کے حوالے سے مجدد کہا گیا یعنی مجدد الف ثانی۔(۱۷۰) اور واقعتاً انہوں نے دین کی تجدید کا حق ادا کیا۔ دوسری طرف عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تمام تر توجہ حدیث پر مرکوز کی اور اسلامی تعلیمات کو پوری طرح روشن کر دیا۔ انہوں نے حدیث پر سو سے زائد کتب تحریر کیں۔

شیخ احمد سرہندی نے بہ راہ راست سیرت پر کوئی کام نہیں کیا لیکن انہوں نے جو ماحول پیدا کر دیا تھا وہ ہندوستان میں سیرت کے کام کی شمع جلانے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ ان کا سب سے اہم کام نبوت کے بارے میں پیدا کردہ غلط فہمیوں کا محاکمہ اور ازالہ کرنا تھا۔ یہ کام انہوں نے اپنی جوانی کے ایام میں ہی شروع کر لیا تھا۔ وہ تھا رسالہ فی اثباۃ النبوۃ کی تصنیف۔ دلائل نبوت کے حوالے سے شیخ احمد کا بیان پچھلے خطبے میں گزر چکا۔ مجدد کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے انتہائی موثر طریقے سے افکار میں قرآن وحدیث کی بالادستی کو قائم کیا۔ وہ خود ایک صوفی تھے تو انہوں نے صوفیا کے شطحیات پر نقد کی جس کا اثر ہر ذی شعور پر ہوا، کیوں کہ فقط عالم ہونے کو لوگ صوفی ہونے کے مقابلے میں کم تر سمجھتے تھے۔ مجدد تصوف کے اس مقام پر فائز تھے کہ وہ بڑے سے بڑے صوفی کی بات بے دھڑک ہو کر رد کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے انہیں شیخ محی الدین ابن عربی کے کسی قول کا حوالہ دیا تو انہوں نے کہا: مارا کلام محمد عربی در کار است نہ کلام محی الدین عربی ''ہمیں محمد عربی ﷺ کے کلام سے غرض ہے ابن عربی کے کلام سے نہیں''۔ وفتوحات مدنیہ مارا از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است ''ہمیں فتوحات مدنیہ یعنی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات فتوحات مکیہ یعنی ابن عربی کے ارشادات سے مستغنی کرتے ہیں''۔ ایسی بات تصوف میں ایک بلند مرتبے کا حامل شخص ہی کہہ سکتا تھا۔(۱۷۱) اسی طرح انہوں نے علما کو بھی دو قسموں میں شمار کیا، علمائے حق اور علمائے سو۔ اس دور میں علما بڑے بڑے عہدوں پر متمکن تھے ان کے بارے میں اس قسم کی رائے کا اظہار کرنا ایک جرات مندانہ قدم تھا۔ اسی لئے علامہ اقبال نے انہیں the greatest religious genius of Muslim India کہا اور ان کی نذر یہ شعر کیا:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد کے خطوط شریعت کے حوالے سے قیمتی دستاویز ہیں اور مکتوبات امام ربانی کے نام سے شائع شدہ ہیں۔ یہ انہوں نے شریعت سے متعلق اشکالات کے ازالے کے طور پر مختلف لوگوں کو لکھے تھے جن میں شریعت کے تمام مباحث پائے جاتے ہیں۔ حضرت مجدد کا حلقہ اثر ہندوستان سے بھی باہر پھیلا اور جہاں جہاں اس طرح کی گم راہی پائی جاتی تھی وہاں ان کے مکتوبات سے استفادہ کیا گیا۔ خود مشرق وسطیٰ میں ان کی تحریروں سے کسب فیض کیا گیا۔ ان کے مکتوبات کا عربی ترجمہ ہوا اور ترک علما نے ان کی کتابیں عرب دنیا میں شائع کیں۔

اس عہد کی دوسری شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو اگر شمالی ہند میں حدیث اور سیرت کا جد امجد قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علم حدیث میں ان کا پایہ اس سے جانا جاسکتا ہے کہ محدث ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ انہوں نے حجاز میں چار سال تک قیام کیا اور وہاں کے بڑے بڑے علما سے علم حدیث حاصل کیا۔ ہندوستان میں انہوں نے پچاس سال تک درس حدیث دیا۔ مشکوٰۃ المصابیح کو جو حدیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے انہوں نے داخل نساب کیا جو آج تک مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے لئے انہوں نے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھیں۔ (۱۷۲) حدیث کے حوالے سے انہوں نے شاہ جہاں کے کہنے پر چالیس منتخب احادیث پر ایک کتاب تحریر کی، جس میں حکم رانوں کے لئے حدیث نبوی سے ہدایات ملتی ہیں۔

سیرت پر بھی ابتدائی اور بہترین کتابیں شیخ ہی کے قلم سے سامنے آئیں۔ سب سے پہلی کتاب انہوں نے مدارج النبوۃ کے نام سے لکھی جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ برعظیم میں لکھی جانے والی پہلی اور مستند ترین سیرت کی کتاب ہے۔ (۱۷۳) یہ کتاب کئی بار چھپی لیکن اس کا فارسی نسخہ عام نہیں ملتا جس کے باعث اصل عبارت سے استفادہ کرنے میں مشکل درپیش آتی ہے۔ البتہ اردو ترجمے کئی ہیں۔ (۱۷۴) علامہ ہاشم ٹھٹوی کی کتاب کے طرز پر بھی شیخ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ماثبت من السنة فی ایام السنة ہے۔ اس کا نفس مضمون یہ ہے کہ سال کے ۳۵۶ دنوں میں کون کون سے اعمال کرنے سنت ہیں۔ ایک اور کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب ہے جو انہوں نے حب رسول کے جذبے کے تحت لکھی۔ اس میں انہوں نے مدینے کی خوبیوں کے بارے میں جو کچھ قدیم کتب میں ملتا ہے اس کو انہوں نے بہت جامع تلخیص کی ہے اور سب سے زیادہ استفادہ علامہ نورالدین سمہودی کی کتاب وفاالوفا سے

کیا ہے۔(۱۷۵) یہ کتاب انہوں نے حجاز میں لکھی تھی اور رسول اللہ ﷺ کے قدمین شریف کی طرف بیٹھ کر اس کے ابتدائی صفحات تحریر کئے۔ ۹۹۸ھ میں اس کو شروع کیا اور ۱۰۰۱ھ میں ہندوستان واپسی تک اسے مکمل کیا اور ہندوستان میں ہی اس کو متعارف کروایا۔ اس میں مدینہ کے ناموں کی، جو سو کے قریب ہیں لغوی تشریح کی گئی ہے اور مکے کی نسبت سے اس کی افضلیت کے بارے میں مباحث موجود ہیں جو مدینے سے عشق کا اظہار ہیں۔ شیخ کی ایک اور کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو حدیث کی کتاب بھی ہے اور سیرت کی بھی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک سے متعلق ہے۔ اس کا نام **مطلع الانوار البهيه فى الحلية النبوية** ہے۔

برعظیم میں اسلامی علوم کا تیسرا اور درخشاں عہد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ کا ہے۔ (۱۷۶) شاہ ولی اللہ کا بنیادی ہدف امت کے لئے اتحاد کی بنیادیں فراہم کرنا تھا، تاکہ اس کے افتراق کو ختم کرنے میں مدد ملے۔ امت کو تین باتوں پر اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔ قرآن، حدیث اور سنت مبارکہ، شاہ صاحب نے ان تینوں پر کما حقہ کام کیا۔ قرآن کا فارسی میں ترجمہ کرکے اسے عام فہم بنایا (۱۷۷) اور سب سے بڑی بات یہ ہے اسے درسی نصاب میں شامل بھی کروایا۔ انہوں نے قرآن پاک کے تفسیری اصولوں پر کتابیں بھی لکھیں۔ اصول تفسیر پر بھی، قرآن پاک کے بعض مشکل الفاظ اور غرائب پر بھی اور اپنی متعدد کتابوں میں، حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں تفسیر قرآن کے بارے میں اتنی کثرت سے اشارات کئے ہیں کہ انہوں نے برصغیر میں علوم قرآنی کو ایک نئی جہت دے دی۔

حدیث میں جس طرح شیخ عبدالحق نے مشکوٰۃ المصابیح کو منتخب کیا، شاہ ولی اللہ نے موطا امام مالک کو منتخب کیا۔ اپنے بنیادی ہدف کے حوالے سے یہ ایک احسن انتخاب تھا، کیوں کہ جتنے فقہی مسالک ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام مالک کی ذات میں جمع ہوجاتے ہیں۔ (۱۷۸) اس کے علاوہ صحیحین کی تدوین سے قبل موطا قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب مانی جاتی تھی۔ شیخ عبدالحق کی طرح شاہ صاحب نے بھی موطا کی دو شرحیں لکھیں، ایک عربی میں علما کے لئے اور دوسری فارسی میں عامۃ الناس کے لئے۔

شاہ صاحب نے سیرت پر ایک رسالہ لکھا اور اسے بھی شامل نصاب کیا۔ اس طرح سے برعظیم میں سیرت پر سب سے پہلی درسی کتاب شاہ ولی اللہ نے متعارف کروائی۔ یہ رسالہ اصل میں ابن سید الناس (ان کا ذکر پہلے ابواب میں ہو چکا) کی تصنیف **عيون الاثر فى فروع المغازى والشمائل والاثر** کی تلخیص در تلخیص ہے۔ یعنی ابن سید الناس کی کتاب کی تلخیص تھی، **نور العيون فى تلخيص سيرت**

الامین المامون۔اس کی پھر تلخیص شاہ صاحب نے سرور المحزون کے نام سے کی۔ جیسے ابن سید الناس نے تمام کتب سیرت کا ایک خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کی تھی اسی طرح شاہ صاحب کی کتاب بھی سیرت کے تمام مباحث پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے اردو تراجم کثرت سے ہوئے ہیں۔(۱۷۹)

اس کے بعد چوتھا اور بھرپور دور شروع ہوا جسے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جنگ آزادی سے قبل اور اس سے بعد۔اس دور میں اردو میں سیرت نگاری کو رواج حاصل ہوا۔شاہ صاحب کے عہد میں گو اردو عام ہو چلی تھی لیکن انہوں نے یا شاہ عبدالعزیز نے کوئی کتاب اردو میں تصنیف نہیں کی۔ ہر زبان کی طرح اردو کا آغاز بھی نظم سے ہوا لہٰذا سیرت نگاری بھی نظم کی شکل میں شروع ہوئی۔اس عہد میں مرثیہ نگاری کا بہت رجحان تھا لہٰذا اس طرز پر معراج نامے، میلاد نامے، وفات نامے اور شمائل کی طرح کی سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔لیکن اصل میدان بہ ہر حال نثر تھا اس لئے اس پر بھی کام کا آغاز ہوا۔(۱۸۰) جنگ آزادی سے قبل اس سلسلے میں ایک نمایاں نام قاضی بدرالدولہ کا ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ کے جد امجد تھے۔ ان کی کتاب فوائد بدریہ قدیم اردو زبان یعنی دکنی میں ۱۸۳۹ میں لکھی گئی جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔قاضی بدرالدولہ بہت بڑے فقیہ تھے اور ریاست کرناٹک کے قاضی القضاۃ تھے۔انہوں نے بڑے مستند ماخذوں سے اپنی کتاب کو مرتب کیا، اس طرح یہ اردو پر پہلی مستند ترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ ایک کتاب ایک مجاہد، فقیہ اور عالم مفتی عنایت احمد کاکوروی نے جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں ملنے والی اسیری کے دوران لکھی۔انہیں جزائر انڈیمان المعروف کالا پانی میں قید کیا گیا، جہاں انہیں لوگوں کے گھروں کی گندگی صاف کرنے کی سزا دی گئی۔اس اسیری میں انہوں نے محض اپنی یادداشتوں کی بنا پر تین کتابیں لکھیں جن میں سے ایک سیرت پر تھی۔اس کا نام تواریخ حبیب الہ ہے۔(۱۸۱) اتفاق سے ان کی ملاقات ایک شریف انگریز سے ہوئی جو آپ کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا۔جب اسے پتہ چلا کہ آپ سابق قاضی ہیں تو اس نے سفارش کر کے آپ کو رہائی دلوائی۔آپ نے واپس دہلی آ کر تمام حوالہ جات کا موازنہ کیا اور ایک بھی غلطی نہ پا کر تینوں کتابیں شائع کروادیں۔

اس عہد کا ایک اور اہم کام قدیم کتب سیرت کا اردو میں ترجمہ تھا۔ان میں سے ایک کتاب فتوح الشام تھی جو ترجمہ ہوئی۔ یہ غلط طور پر واقدی سے منسوب کر دی گئی ہے۔اس میں صحابہ کرام کے ہاتھوں شام کے جو علاقے فتح ہوئے ان کی تفصیل ہے۔اس کا ترجمہ ۱۲۸۴ھ میں ایک بزرگ مولوی سید عنایت حسین نے کیا جو نول کشور لکھنو سے شائع ہوا۔تقریباً اسی زمانے میں لکھنو کے ایک بزرگ عبدالرزاق کلامی

نے صمصام الاسلام کے نام سے اس کتاب کا منظوم ترجمہ تیار کیا۔ یہ منثور ترجمے سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہوا۔ فتوح الشام کے علاوہ شمائل ترمذی کا ترجمہ بھی کئی بار شائع ہوا۔ یہ ترجمہ مولانا کرامت علی جونپوری نے جو سید احمد شہید کے تلامذہ میں سے تھے کیا تھا۔ یہ ترجمہ انوار محمدی کے نام سے ۱۲۱۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ زاد المعاد کا ایک نامکمل ترجمہ اردو زبان وادب کی ایک بہت بڑی شخصیت نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے کیا تھا۔ (۱۸۲) سیرت ابن ہشام کا ترجمہ بھی ایک سے زیادہ لوگوں نے کیا۔ مشہور صحافی مولوی انشاء اللہ خان نے مفید حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا جو ۱۹۱۲ میں لاہور سے چھپا۔ قاضی عیاض کی الشفا کا ترجمہ مولانا محمد اسماعیل کاندھلوی نے شمیم الریاض کے نام سے کیا جو نول کشور لکھنو سے ۱۹۱۲ میں چھپا۔ اسی طرح سے دوسری کتابوں کے تراجم بھی ہوتے گئے۔

جنگ آزادی کے بعد چوں کہ انگریز اقتدار پر بلاشرکت غیرے قابض ہو کر اپنا قانون نافذ کر چکے تھے، لہٰذا یہ چیز علمی تحریک پر بھی اثر انداز ہوئی۔ انگریزوں کے اس طرح حاکم بن جانے پر عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذات پر کھلے انداز میں حملے ہونے لگے۔ مسلمان اب ایک مقہور ملت سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا ان کا ردعمل معذرت خواہانہ تھا لیکن اس معذرت خواہانہ انداز نے بھی ایسے علمی کارناموں کی طرح رکھی جن پر برعظیم کے مسلمانوں کو ناز ہونا چاہئے۔ رسالت مآب ﷺ کی ذات پر حملوں کے حوالے سے پہلی کتاب ایک مرتد پادری عماد الدین نے لکھی، جس کا جواب مولانا الطاف حسین حالی اور سرسید کے رفیق کار مولوی چراغ علی نے دیا۔ اس طرح کے سوقیانہ حملے جاری رہے حتیٰ کہ ہندوستان میں مقیم ایک دانشور انگریز ولیم میور لیفٹننٹ گورنر یوپی نے باقاعدہ تحقیق کے اصولوں کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے متعلق مشہور کتاب Life of Muhammad لکھی جس میں مستند ماخذوں کو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر بے شمار اعتراضات کئے گئے۔ (۱۸۳) حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا جواب دور جدید میں مسلمانوں کی سیرت نگاری کی بنیاد بنا۔ خطبات احمدیہ کے نام سے اس کا جواب سرسید خان نے انگلینڈ میں بیٹھ کر تحریر کیا جو بارہ خطبات پر مشتمل تھا، لیکن یہ نامکمل تھے اور سرسید صرف رسول اللہ ﷺ کے سفر شام تک جو انہوں نے بارہ سال کی عمر میں کیا تھا کے اعتراضات کا جواب دے سکے۔ (۱۸۴) باقی حصہ وہ کسی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ اس ضمن میں ہونے والے اخراجات کو قرض لے کر حتیٰ کہ گھر فروخت کر کے بھی پورا کیا گیا اور اسے توشہ آخرت سمجھ کر سرانجام دیا۔ (۱۸۵) لہٰذا سیرت کے اس دبستان کو اگر دبستان سرسید کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سرسید نے اس کا جواب لکھنے کے لئے انگلستان جانا اس لئے ضروری سمجھا کہ ہندوستان میں وہ ماخذ دست یاب نہیں تھے جو ولیم میور کی کتاب کا جواب دینے کے لئے ضروری تھے۔ یہاں انہوں نے ہر قسم کی کتابوں سے استفادہ کیا جن میں سے بیش تر انگریز ہندوستان سے اٹھا کر لے آئے تھے۔ علاوہ ازیں یورپ کی قدیم تواریخ اور ادب سے بھی استفادہ کیا جو میور کے ان اعتراضات کا جواب دینے میں مدثابت ہوئیں، جو اس نے زمانہ قبل مسیح کے حوالے سے کئے تھے۔ ان میں خانہ کعبہ کی تعمیر (۱۸۶)، رسول اللہ ﷺ کا حضرت ابراہیمؑ کے نسب سے ہونا (۱۸۷)، جب فاران وغیرہ کی تاریخی حیثیت (۱۸۸) میں تشکیک جیسی باتیں شامل تھیں۔ اس طرح سے سرسید نے اس بات کی طرح ڈالی کہ اسلامی علوم کو دیگر قدیم اور جدید علوم کی مدد سے بیان کیا جائے تا کہ غیر مسلموں کو اسے سمجھنا آسان ہو۔ اصل میں یہ اصول ہے کہ کسی کی زبان میں اسے جواب دیا جائے تو اسے سمجھ آسکتی ہے۔ اس وقت کی دنیا روایتی دلائل سے ہٹ کر عقلی دلائل میں بات کرنے اور سننے کی عادی ہو چلی تھی۔ علوم اسلامیہ میں اس چیز کی داغ بیل سرسید احمد خان نے ڈالی۔ جب وہ جبل فاران کی جغرافیائی حیثیت کو دیگر کتب سے متعین کرنے میں کام یاب ہو گئے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نواب محسن الملک کو لکھا کہ اگر تم ہوتے تو اس کو دیکھ کر اش اش کر اٹھتے اور پھر اپنے زمانے کے بعض لوگوں پر تنقید کی ہے کہ فلاں فلاں کے بس میں نہیں تھا کہ وہ یہ کام کر سکتے۔ پھر شکایت آمیز انداز میں لکھا کہ پھر بھی میں کافر کا کافر ہی رہوں گا اور یہاں کے مولوی مجھے پھر بھی کافر ہی کہیں گے۔ (۱۸۹)

سب سے اہم اسلوب جس کی سرسید نے طرح ڈالی وہ اسلامی مصادر کا از سر نو جائزہ تھا۔ اس سے قبل یہ بات تفصیل سے بیان ہو چکی کہ سیرت کے مصادر میں تمام کتب میں ایک پائے کی نہیں اور نہ ایک کتاب کی تمام روایات ایک حیثیت رکھتی ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ لوگوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا اور محل نظر روایات بھی کثرت سے روایت ہو کر کتابوں میں آگئیں۔ انہیں روایات کو بنیاد بنا کر ولیم میور نے اعتراضات کا سلسلہ دراز کیا۔ سرسید احمد خان نے مصادر کی جانچ پرکھ کے لئے تجزیے کی طرح ڈالی، تا کہ اندرونی شہادتوں کی مدد سے روایات کے موضوع ہونے کی نشان دہی کی جا سکے، کیوں کہ ایک غیر مسلم کے نزدیک بخاری اور واقدی کا درجہ ایک ہی ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے واقعاتی دلائل کو استعمال کر کے مصادر پر بحث کی۔ اس پر انہوں نے پورا ایک خطبہ تحریر کیا۔

سرسید نے سیرت نگاری میں ایک اور طرز رائج کیا وہ تھا قدیم کتابوں خاص طور پر تورات اور زبور کا

بہ راہ راست مطالعہ کیا اور ان کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو بشارات تھیں ان کو جمع کر کے ایک مرتب انداز میں پیش کیا۔ یہ سارے اسلوب بعد میں سیرت نگاروں نے اپنائے۔ سیرت کے ماخذ کی تنقید ہر سیرت نگار نے کی، مغربی اہل علم کے حوالے اب ہر سیرت نگار دیتا ہے، تورات اور انجیل جیسی قدیم کتابوں سے سیرت کے مضامین کی تائید اب سب کرتے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ انہوں نے دو اور کتابوں کا ترجمہ کیا جو نسبتاً معتدل اور موافقانہ نقطہ نظر کی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب Apology for Muhammad and Quran تھی سرسید نے اس کو اپنے خرچ پر شائع کروایا اور اس کے چار سو نسخے ہندوستان بھیجے اور اپنے ایک دوست کو لکھا کہ تمام بڑے بڑے انگریز افسران، انگریزی خواں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس کا ایک ایک نسخہ میری طرف سے تحفے میں دے دو۔ سرسید کے خطبات ۱۸۷۲ میں ہندوستان میں چھپے جب کہ ان کا انگریزی ترجمہ ان کے انگلستان کے قیام کے دوران ہی ۱۸۷۰ میں چھپ گیا تھا۔ سرسید نے جنگ آزادی سے قبل بھی ایک کتاب سیرت پر لکھی تھی جس کا نام جلا القلوب بذکر المحبوب تھا اور یہ ۱۸۴۶ میں لکھی گئی۔ یہ چوں کہ روایتی انداز میں لکھی گئی تھی لہٰذا بعد میں سرسید نے اپنی اس رائے سے رجوع کر کے نیا اسلوب اپنا لیا۔

ایک اور بلند پایہ نام سید امیر علی کا ہے جو انگریزی ادب میں گہرا درک رکھنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے۔ وہ کلکتہ ہائی کورٹ اور برطانیہ کی عدالت عظمیٰ پریوی کونسل کے پہلے مسلمان جج تھے۔ انگریزی قانون کو خوب جانتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی فارسی پر بھی عبور تھا۔ سرسید پر ان کو یہ فوقیت حاصل تھی کہ انگریزی ماخذ سے استفادہ کے لئے انہیں ترجمے کی ضرورت نہیں تھی۔ علاوہ ازیں انگریزوں سے رشتے داری کے باعث جو ان کا اثر ورسوخ تھا وہ سرسید کا نہیں تھا، لہٰذا وہ سرسید کی طرح ان سے مرعوب نہیں تھے۔ (۱۹۰) وہ بھی میور کی کتاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور بڑے عالمانہ انداز و بلیغ زبان میں ACritical Appraisal of the Lif ar 1 Achievements of Muhammad کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ایک ہی جلد میں دو حصوں پر مشتمل تھی، ایک میں سیرت کا بیان اور دوسرے میں رسول اللہ ﷺ کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔ اسلامی تمدن، شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۳ میں چھپی جب کہ سید امیر علی کی زندگی میں اس کا آخری ایڈیشن ۱۹۰۹ میں شائع ہوا جس کا عنوان تبدیل کر کے The Spirit of Islam رکھ دیا گیا اور آج تک یہ اسی نام سے موسوم ہے۔ خطبات احمدیہ کے مقابلے میں اس

کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ انگریزی زبان سے استفادے کی بات ہوچکی۔ سرسید نے سارازورمیور کی کتاب کا جواب لکھنے میں لگایا جب کہ سید امیر علی نے سیرت اور اسلامی تعلیمات کا ایک جامع نقشہ جدید اسلوب میں پیش کرنے پر توجہ مبذول کی۔ اپنی جامعیت اور اصلیت (originality) کی بہ دولت یہ کتاب آج بھی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور ایک حوالے کی کتاب کے طور پر جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

سرسید کے حلقے کی ایک اور قابل ذکر شخصیت جنہوں نے سیرت پر کام کیا وہ علی گڑھ کالج کے استاد سید نواب علی تھے۔ ان کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا۔ انہوں نے مستشرقین کے کاموں کا جائزہ لے کر سیرت پر ایک جامع کتاب سیرت رسول اللہ کے نام سے تیار کی۔ انہوں نے اور بھی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ انہوں نے بچوں، نوجوانوں اور زیادہ عمر کے قارئین کے لئے تین الگ الگ کتابیں تیار کیں۔ لیکن ان کی یہ کتابیں شمالی ہند میں زیادہ مقبول نہ ہوسکیں۔

اس عہد کی ایک اور نابغہ روزگار شخصیت مرزا حیرت دہلوی تھے جو ایک غیر معمولی ادیب تھے۔ بہت مختلف فیہ بھی رہے۔ (۱۹۱) انگریزوں کے معتوب رہ کر ان کی قید بھی کاٹی۔ انہوں نے سیرت رسول ﷺ پر ۱۹۰۲ میں چھ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب قدیم اسلوب سے جدید اسلوب کی طرف پیش قدمی کے سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان بڑی ادیبانہ اور عالمانہ ہے۔ لیکن مندرجات کے بارے میں اکثر اہل علم کو تامل تھا۔ ناقدین کا کہنا تھا کہ مصنف نے ادبیت پر تاریخیت کو قربان کردیا ہے۔

باب یازدہم: مطالعہ سیرت دور جدید میں

مغرب کے سیاسی وتہذیبی عروج نے زندگی کے تمام شعبوں کا قبلہ تبدیل کردیا۔ البتہ یہ تبدیلی کہیں طوعاً تھی اور کہیں کرہاً۔ مسلم حلقے جو اس تبدیلی کو مثبت خیال نہیں کرتے تھے انہیں بھی اپنا لائحہ عمل بہ ہر حال اس تبدیلی کے مطابق طے کرنا پڑا۔ اسی میں سیرت نگاری کا شعبہ بھی تھا۔ علوم کے حوالے سے جدیدیت نے جو نئے مسائل اور نئی جہتیں متعین کیں سیرت نگاروں کی ان سے بے اعتنائی خارج از امکان تھی۔ جدید دور میں سب سے اہم پیش رفت چھاپہ خانے کی تھی جس کے باعث ہر طرح کی کتب ہر جگہ دست یاب آنے لگیں جس سے محققین کی تحقیق میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ جب کہ اس سے قبل بہت ساری تحقیق

اس وجہ سے ادھوری رہ جاتی تھی کہ تمام ماخذوں تک رسائی ممکن نہیں ہوتی تھی۔ تمام ماخذوں کی دست یابی سے ہی یہ ممکن ہوا کہ سیرت کی زیادہ جامع کتابیں مرتب ہونے لگیں جس سے محققین کی تحقیق میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ علوم کے مراکز اور تعلیم کا معاش سے تعلق بن جانے سے علوم میں تخصص کا سلسلہ شروع ہوا تو علم سیرت کو بھی جدید تقاضوں کے مطابق مرتب کرنے کا آغاز ہوا۔ علوم میں تجزیاتی اسلوب کی روایت نے مصادر سیرت کا از سر نو جائزہ لینے کی طرف توجہ دلائی، تاکہ جدید ذہنوں کے لئے سیرت کے مجموعے تیار کئے جاسکیں۔(۱۹۲) جدید دور کی ایک اور خصوصیت استشراقیت تھی جس نے مغربیت کی سیاسی وتہذیبی برتری کو ازل سے ثابت کرنے کے لئے اسلامی علوم کے بارے میں تشکیک کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی ذات کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا گیا۔ یہ وہ چیز ہے جو دور جدید میں سیرت پر کام کا سب سے بڑا محرک بن کر سامنے آئی۔ امت محمدیہ کے احساس رکھنے والے لوگوں نے اپنی زندگی کے شب وروز اس کام کے لئے لگا دیئے اور دلائل کا ایسا اسلوب سامنے لے کر آئے جس نے مستشرقین کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ مصادر اور ان کے بارے میں آرا کو اس طرح سے مرتب کیا گیا کہ کسی کو ان کے بارے میں تشکیک پھیلانے کا یارانہ رہا۔ دیگر علوم کی بے بہا ترقی نے بھی سیرت نگاری کو متاثر کیا اور سیرت نگاروں نے ان علوم کی روشنی میں سیرت پر لکھنا شروع کیا۔ مثال کے طور پر طب کو بہ طور ایک الگ شاخ کے پڑھنے پڑھانے سے لوگ اس طرف متوجہ ہوئے کہ طب نبوی پر لکھا جائے، لہٰذا طب نبوی پر کتابیں لکھی گئیں۔ عسکریات جب باقاعدہ مضمون کے طور پر متعارف ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی جنگی حکمت عملی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اسی طرح دیگر شعبوں میں بھی سیرت کی روشنی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا جس نے سیرت کو باقاعدہ علم کے طور پر پھر سے قائم کیا۔ ان باتوں کو بعض جگہ تفصیل سے اور بعض جگہ اختصار کے ساتھ پچھلے ابواب میں بیان کیا گیا۔ اس باب میں بیسویں صدی میں سیرت پر ہونے والے کام کا جائزہ لیا جائے گا۔

بیسویں صدی کے آغاز کا اہم ترین کام قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے کیا جو انگریزی قانون کے ماہر تھے اور انگریزی عدلیہ سے وابستہ بھی رہے۔ ان کے سیرت پر قلم اٹھانے کا محرک بھی مستشرقین کے اعتراضات ہی ٹھہرے لیکن انہوں نے کسی اعتراض کو مخاطب کئے بغیر ان مضامین کا احاطہ کیا جو عام طور پر ان اعتراضات سے متعلق تھے۔ ان کی کتاب کا نام رحمۃ للعالمین ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔(۱۹۳) آخری جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس میں بہت ساری چیزیں ایسی بیان ہوئیں

جو دوسرے سیرت نگاروں نے نہیں بیان کی تھیں۔ اعداد وشمار کے حوالے سے اس کتاب میں بہت تفصیل پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں غزوے میں کتنے مسلمان شہید ہوئے، کتنے کافر مارے گئے وغیرہ۔ حتیٰ کہ مصنف نے رسول اللہ ﷺ کے زندگی کے دنوں اور گھنٹوں تک کو شمار کر کے آپ ﷺ کی زندگی کے مختلف ادوار کو بیان کیا۔ مقدمے میں انہوں نے آپ ﷺ کا نسب نامہ بیان کیا۔ ہے، جس میں قریش کے بنی اسماعیل سے ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ پہلی جلد میں سیرت کے پیغام کو سیرت کے واقعات کا تکملہ بنا کر پیش کیا ہے۔ دوسری جلد میں غزوات اور آپ ﷺ کے خاندان کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں۔ تیسری جلد میں خصائص نبوی، خصائص قرآن اور خصائص اسلام پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ اس طرح سے اس کی تین جلدیں پوری ہوتی ہیں۔ قاضی صاحب کے ہاں تحقیق، تجزیہ اور عشق رسول کا جو امتزاج ہے یہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ واقعات کو مستند ترین انداز سے پیش کرنے کا جو التزام انہوں نے کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ صرف مستند مصادر سے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کا دوسرا کام جس کی زمانہ آج تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے وہ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ہے۔ شبلی نعمانی نے بھی مستشرقین کے اعتراضات سے متاثر ہو کر اس کام کا آغاز کیا، لیکن چاہتے تھے کہ ایسا کام ہو کہ پھر کسی کو اعتراض کرنے کی ہمت نہ ہو۔ (۱۹۴) اول تو اس کے لئے انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنا چاہتے تھے، لیکن صحت نے اجازت نہ دی۔ البتہ اس کے لئے ایک ادارہ ضرور قائم کر لیا تھا۔ کتاب کی پہلی ہی جلد مکمل کرنے پائے تھے کہ وقت موعود آ گیا اور بقیہ کتاب ان کے کہنے پر ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے کل سات جلدوں میں مکمل کی۔ دونوں حضرات جس طرح کا علمی مقام رکھتے تھے اس کی وجہ سے کتاب چھپنے سے قبل ہی اس کا چرچا ہونے لگا اور پہلی جلد کے دیباچے کا جملہ ہی یہ تھا، ''سیرت النبی جس کے غلغلے سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے''۔ سرسید کی طرح شبلی بھی یورپی زبانوں سے ناواقف تھے علاوہ ازیں بہت سارے مصادر ان کی پہنچ میں نہ تھے۔ البتہ انہیں ایسے مدد ضرور مل گئے تھے جو انگریزی زبان جانتے تھے۔ یہ تمام باتیں انہوں نے مقدمے میں بیان کی ہیں جو بہت عالمانہ اور وقیع انداز میں لکھا گیا ہے۔ (۱۹۵)

شبلی نعمانی کا انداز کیا تھا اور وہ کس طرح سیرت لکھنا چاہتے تھے وہ ان کے پہلے ہی جملے سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس

انسانی کے اخلاق وترتیب کی اصلاح وتکمیل کی جائے۔

گویا وہ پوری سیرت کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی شرح بنانا چاہتے تھے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ پھر انہوں نے لکھا: پہلے فضائل اخلاق کے اصول قائم کئے جائیں، پھر ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔ عملی تعلیم شبلی کے بہ قول وعظ وپند کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ تصنیف وتالیف کے ذریعے ہوسکتی ہے، اور قانون کے ذریعے ہوسکتی ہے، لیکن یہ سارے طریقے جزوی طور پر تو اثر انداز ہوسکتے ہیں، مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ مکمل اثر پذیری کے لئے ضروری ہے کہ فضائل اخلاق کا عملی نمونہ پیش کیا جائے۔ جب عملی نمونہ سامنے آگیا تو اس کے ذریعے سے وعظ وپند بھی ہوگیا، تصنیف کتب بھی ہوئی اور قوانین بھی آگئے۔ شبلی متکلم بھی تھے اور مورخ بھی ان کے شاگرد متکلم ومورخ ہونے کے ساتھ علم تفسیر اور علم حدیث کے بھی بہت بڑے فاضل تھے۔ ان دونوں کے قلم سے جو کتاب تیار ہوئی اس نے بہت سی تشنگیوں کو رفع کردیا۔

شبلی کی ہاں بھی کہیں کہیں معذرت خواہانہ انداز پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جو ابتدائی معرکے ہیں ان کے بارے میں مستشرقین نے لکھا ہے کہ یہ مال غنیمت کی خاطر کئے گئے۔ شبلی اس اعتراض سے متاثر ہوگئے اور انہوں نے غزوات کی اس طرح سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کئی جگہ مسلمانوں کے متفق علیہ نقطہ نظر سے، جس کی قرآن پاک سے بھی تائید ہوتی ہے، انحراف سا آگیا۔ خاص طور پر غزوہ بدر کے معاملے میں خود سید سلیمان ندوی نے بھی ان سے اتفاق نہیں کیا۔

سید سلیمان ندوی کا ایک اور بڑا کارنامہ خطبات مدراس ہے، جو ان کے لیکچرز پر مشتمل ہے۔ (۱۹۶) یہ مختصر کتاب معنی میں بہت جامع اور بلند ہے۔ انہوں نے اپنی بحث کا آغاز ایک منطقی تدریج سے کیا۔ ان کا مقدمہ ہے کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لئے انبیا علیہم السلام کی سیرت کی محتاج ہے۔ اس تکمیل کے لئے ایک دائمی اور عالم گیر نمونہ ہونا ضروری ہے۔ دائمی اور عالم گیر نمونہ وہی ہوسکتا ہے جو تاریخی طور پر ثابت ہو۔ علاوہ ازیں وہ عملی بھی ہو اور غیر عملی نہ ہو۔ ان تمام چیزوں سے بحث کرنے کے بعد انہوں نے ثابت کیا کہ یہ تمام باتیں صرف پیغمبر اسلام ﷺ پر ثابت آتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ کوئی شخصیت ان پر پورا نہیں اترتی۔ یہ آٹھ خطبات ہیں جو سیرت کے ذخیرے میں مختصر ہونے کے باوجود ایک منفرد اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بیسویں صدی کا دوسرا نصف مجدد علوم سیرت ڈاکٹر حمید اللہ کے نام سے مزین ہے۔ (۱۹۷) علم

سیرت کا آغاز دو شعبوں سے ہوا، سیر یعنی بین الاقوامی قانون اور مغازی یعنی غزوات اور سیرت کے دیگر واقعات۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان سب پر بہت تفصیل اور نہایت محققانہ انداز سے لکھا اور ان موضوعات پر ان کی کتابیں بڑی خاصے کی چیز ہیں۔ ان کی خاص دل چسپی کا میدان اسلامی قانون تھا۔ وہ سات زبانوں کے ماہر تھے اور عام طور پر اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور عربی میں لکھتے تھے۔ انہوں نے سیرت کے بہت سے ایسے گوشے متعارف کروائے جو اس سے پہلے کسی نے متعارف نہیں کروائے تھے۔ مثال کے طور پر شہری مملکت مکہ، شہری مملکت مدینہ، میثاق مدینہ دنیا کا پہلا تحریری دستور (۱۹۸) وغیرہ سب ان ہی کی دریافتیں ہیں جو انہوں نے قدیم ماخذوں سے جمع کر کے مرتب کیں۔ انہوں نے بہت سی قدیم کتابوں کو ایڈٹ بھی کیا۔ واقدی کی کتاب الردہ، بلاذری کی انساب الاشراف اور سیرت ابن اسحاق انہیں کی کاوش سے منظر عام پر آئیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عہد نبوی کی ڈپلومیسی اور سفارت کاری پر اتنا وقیع کام کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ سب سے پہلے انہوں نے مسلم انٹرنیشنل لا پر ایک کتاب The Muslim conduct of State لکھی۔ اس کے بعد انہوں نے فرانسیسی میں دو جلدوں پر ایک کتاب لکھی جس کے عنوان کا انگریزی ترجمہ ہے Diplomacy during the days of the Prophet and the Orthodox Caliphs۔ اس کے بعد انہوں نے جرمنی کی بون یونی ورسٹی سے دوسرا تحقیقی مقالہ لکھا جس میں انہوں نے صدر اسلام کی ڈپلومیسی میں غیر جانب داری کے تصور کے موضوع پر تحقیق کی۔ ان کا یہ مقالہ جرمنی سے ۱۹۳۳ میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔ تحقیق کے دوران انہوں نے محسوس کیا کہ ایسی بے شمار دستاویزات جو عہد نبوی کی سفارت کاری سے متعلق ہیں ان کو یک جا کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انہوں نے ساڑھے چار سو کے قریب یہ دستاویزات، وثائق اور معاہدات جمع کئے، جو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے وثیقہ جات کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔

اس کے بعد ان کو خیال ہوا کہ عہد نبوی کے میدان ہائے جنگ کے بارے میں لکھا جائے تو سفر حجاز کیا اور خود جا کر غزوات کی جگہ کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ روایت کردہ معلومات کس قدر موجود نقشے کے مطابق نکلتی ہیں۔ علامہ واقدی کے بعد یہ کام ڈاکٹر حمید اللہ نے کیا۔ انہوں نے فیتا لے کر ان جگہوں کی پیائش کی اور ان کے نقشے بنائے جو اس سے قبل کبھی نہیں بنے تھے۔ یہ کام بہت مقبول ہوا اور لوگوں نے اپنی کتابوں میں بغیر حوالے کے ان نقشوں کو نقل کیا۔ ان نقشوں سے غزوات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ

گویا سیرت کا صحیح معنوں میں جغرافیہ تھا۔ ان تمام موضوعات پر انہوں نے بہت باریک بینی سے کام کیا اور اس ضمن میں عربی کی تمام لغات اور کتب جغرافیہ کو کھنگال ڈالا۔ (۱۹۹) سیرت پر ان کا سب سے اہم کام فرانسیسی زبان میں دوجلدوں پر مشتمل ہے جس کا انگریزی میں ترجمہ The Prophet of Islam: His Life and Work بنتا ہے۔ یہ دونوں جلدیں انتہائی ٹھوس اور جامع معلومات پر مبنی ہیں اور سیرت کے انتظامی، ادارتی، سفارتی، سیاسی اور دوسرے پہلوؤں پر بہت وسیع اور اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔

مصادر کے غیر مستند ہونے کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے بے شمار لوگوں نے سیرت پر لکھا اور اس میں انہوں نے یہ التزام کیا کہ صرف مستند ماخذ سے رجوع کیا جائے جن میں قرآن قابل ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم کتاب مولانا عبدالروف ابوالبرکات داناپوری کی اصح السیر ہے جو انہوں نے مستند ماخذوں سے مرتب کی اور مغازی پر خاص طور پر توجہ دی۔ اس میں فقہیات سیرت پر بھی اچھا مواد ہے۔ وہ کلامی مسائل سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ایک کتاب قدیم محدثانہ اسلوب پر مولانا ادریس کاندھلوی نے لکھی جو تمام کتب سیرت کا نچوڑ ہے۔ جدید سیرت نگاروں سے جہاں جہاں غلطیاں سرزد ہوئیں اس کی انہوں نے نشان دہی کر دی ہے۔ علامہ اقبال کے کہنے پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے جو کہ مفسر قرآن بھی ہیں قرآن کو سامنے رکھ کر سیرت مرتب کی۔ اس کے لئے انہوں نے مدراس میں پہلے لیکچرز کی صورت میں اس کو دوسروں کے سامنے رکھا، پھر اسے کتابی شکل دی۔ اس کی زبان بہت بلیغ ہے۔ یہ کتاب ایک مفسر، ایک مفکر، ایک متکلم اور ایک فلسفی کے قلم سے نکلی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے پس منظر میں سیرت کا ایک نیا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ایک اور بزرگ محمد عزت دروزہ نے قرآن کی روشنی میں سیرت پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام عصر النبی ہے جس میں قرآن سے مدد لے کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد کے طور طریقے اور رسوم و رواج کا نقشہ مرتب کیا ہے۔ دوسری کتاب سیرت رسول ہے جس میں انہوں نے ان تمام آیات کو جمع کر دیا ہے جو قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آئی ہیں۔ عرب دنیا کے ایک اور صاحب علم ڈاکٹر محمد ابوشہبہ نے قرآن کو بنیاد بنا کر سیرت پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں صحیحین اور قرآن کو معیار قرار دے کر روایات سیرت کا محاکمہ کیا ہے اور ان میں پوشیدہ دروس اور عبرتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسی طرز پر پاکستان کے علامہ عبدالعزیز عرفی نے سیرت پر چار جلدوں میں جمال مصطفیٰ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، جس میں انہوں نے قرآن کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے سیرت کا واقعات کو بیان کیا ہے۔

عسکریات سیرت پر جو کام بیسویں صدی میں ہوا اس میں فن حرب وضرب کے نقطہ نگاہ سے لکھا گیا جو کہ قدیم کتابوں کا رجحان تھا۔ اس پر سب سے پہلے پاکستان کے جنرل محمد اکبر خان نے حدیث دفاع کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اردو زبان میں ایک تربیت یافتہ تجربہ کار جرنیل کے قلم سے رسول اللہ ﷺ کی حکمت حربی کا مطالعہ کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ اس کے بعد عراق کے ایک بریگیڈیئر جنرل محمود شیت نے اس پر کما حقہ کام کیا اور الرسول القائد کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں انہوں نے ہر مشہور صحابی پر فن حرب کے حوالے سے علیحدہ کتاب لکھی اور اس طرح سے درجن کے لگ بھگ کتابیں ان کے قلم سے لکھی گئیں۔ جنرل مصطفیٰ طلاس نے بھی جو شام کے وزیر دفاع بھی رہے سیرت کے حربی پہلو پر لکھا۔ عسکریات سیرت پر ایک جامع اور مفصل کام پاکستان کے بریگیڈیئر گلزار احمد مرحوم کا ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا نام غزوات النبی ہے۔ اس کے علاوہ جنرل آغا ابراہیم علی اکرم نے حضرت خالد بن ولیدؓ پر Sword of Allah کے نام ایک کتاب لکھی جس میں بعض مضامین غزوات نبوی پر بھی ہیں۔

ایک کتاب مولانا مودودی کے قلم سے بھی منظر عام پر آئی جس کا نام سیرت سرور عالم ہے۔ مولانا کی تفسیر، تفہیم القرآن میں جابہ جا سیرت کے مباحث بیان کئے گئے ہیں، اسی طرح مولانا کی دوسری تحریروں میں بھی سیرت سے متعلق بہت سا مواد موجود تھا، جس کی بنا پر ان کے رفقا نے اس سارے مواد کو نکال کر دو جلدوں میں شائع کروایا۔ پہلی جلد تو سیرت کی تمہید ہے جس میں نبوت وغیرہ کے مباحث زیر بحث آئے ہیں جب کہ دوسری جلد ولادت سے ہجرت تک ہے جس میں مولانا نے بہت وقیع اور گراں قدر اضافے کئے ہیں اور جہاں جہاں خلا محسوس کیا اس کو نئی تحقیق اور نئے مطالعے سے پورا کیا۔ مولانا کا خیال تھا کہ مدنی دور کو ایک الگ جلد میں مکمل کیا جائے لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ مستشرقین کی خیانتوں کو انہوں نے جابہ جا بیان کیا ہے، تاکہ مسلمانوں کو گمراہی سے بچایا جائے۔ کیوں کہ وہ ایک تحریک کے قائد تھے جو پاکستان میں ایک اسلامی نظام کی خواہاں ہے، لہٰذا ان کے اسلوب میں یہ بات غالب تھی کہ مندرجات میں سے اسلامی حکومت سے متعلق باتوں کو زیادہ واضح کیا جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انداز علمی وتحقیقی سے زیادہ تحریکی تھا۔ ایک اور کتاب انسان کامل ہے جسے ڈاکٹر خالد علوی نے تحریر کیا ہے اور موضوع کی مناسبت سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی مختلف حیثیتوں کو اس کتاب میں بیان کیا یعنی بہ طور شہری، بہ طور تاجر، بہ طور حاکم وغیرہ۔

آخر میں کچھ تذکرہ عرب دنیا میں سیرت پر ہونے والے کام کا کیا جائے گا۔ عرب دنیا میں بھی

سیرت پر بے بہا کام ہوا لیکن وہ کمیت اور کیفیت میں برعظیم میں ہونے والے کام سے بہ ہرحال کم ہے۔ البتہ سیرت کے ماخذ اور مصادر پر عرب دنیا میں بہت کام ہوا۔ عراق کے ایک مورخ ڈاکٹر جواد علی نے تاریخ العرب قبل الاسلام کے نام سے قبل از اسلام عرب کا ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کیا ہے اور اس موضوع پر اس سے زیادہ مستند کام روے زمین پر نہیں ہوا۔ ایک اور بڑی کتاب جو سیرت پر دنیا کی بہترین کتابوں میں ایک ہے ایک بہت بڑے عالم، مصر کے چار پانچ صف اول کے فقہا میں سے ایک کے قلم سے منظر عام پر آئی۔ یہ خاتم النبیین ہے جسے شیخ ابوزہرہ مصری نے تحریر کیا ہے اور فقہیات سیرت پر اپنی مثال آپ ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان کی آخری کتاب تھی لہٰذا ایک طرح سے ان کی زندگی کے علمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔

عرب دنیا کے حصے میں رابطہ عالمی اسلامی کا بین الاقوامی مقابلہ بھی آتا ہے جس کا اعلان لاہور میں ہونے والی دوسری سربراہی کانفرنس کے موقع پر کیا گیا۔ (۲۰۰) حسن اتفاق سے تینوں انعاموں کے حق دار برعظیم کے لوگ قرار پائے۔ پہلا انعام صفی الرحمٰن مبارک پوری کی الرحیق المختوم کو دوسرا انعام علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ماجد علی خان کی انگریزی کتاب نے حاصل کیا اور تیسرا انعام پنجاب یونی ورسٹی کے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب پیغمبر اعظم و آخر کو ملا۔

سیرت نگاری کا ایک اور اسلوب جس نے بیسویں صدی میں رواج پکڑا وہ سیرت کا ادیبانہ اسلوب تھا۔ یہ اس لئے جدید دور کا رجحان تھا کہ قدیم دور میں سیرت کو افسانے وغیرہ کی شکل میں لکھنا روایتی علما کے ہاں ایک ممنوع امر ہوتا لیکن بیسویں صدی میں بہ ہرحال اس کا آغاز ہوا اور خود عربی میں بھی اس پر لکھا گیا۔ اس سلسلے میں طٰہٰ حسین کی کتاب علی ہامش السیرہ قابل ذکر ہے جو افسانے کے انداز میں لکھی گئی۔ اسی طرح اردو کے ایک مشہور ادیب سید ایوب احمد شاہ جہان پوری نے آفتاب نبوت کے نام سے ایک کتاب لکھی جو کسی حد تک افسانوی رنگ بھی لئے ہوئے ہے۔ علامہ راشد الخیری نے آمنہ کا لعل کے نام سے عورتوں کے لئے کتاب تحریر کی جس انداز میلاد ناموں جیسا ہے۔ برعظیم ہی کے ایک اور ادیب ملا واحدی نے سرور کائنات لکھی۔ مولانا ماہر القادری نے دریتیم افسانوی انداز میں لکھی۔ معراج انسانیت غلام احمد پرویز نے لکھی۔ عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی کے کئی ناول سیرت اور خلافت راشدہ کے پس منظر میں لکھے گئے۔ ادبیات پر سب سے دل چسپ کتاب مولانا مناظر احسن گیلانی النبی الخاتم ہے جو مختصر ہے لیکن البیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔

یہ چند کتابوں کا تذکرہ نمونے کے طور پر تھا، کیوں کہ سیرت پر کتابوں کا سلسلہ لامتناہی قسم کا ہے جن کے تذکرے کے لئے زندگیاں درکار ہیں۔ کچھ مزید کتابوں کا ذکر ایک فہرست کے طور پر درج ذیل ہے۔ جسٹس پیر کرم شاہ کی ضیاالنبی ایک فاضلانہ تصنیف ہے۔ یہ اردو زبان میں بیسویں صدی کی آخری قابل ذکر اور اہم تصنیف ہے۔ تزکیہ نفس کے حوالے سے اسوۂ رسول اکرم ایک اہم تصنیف ہے جسے ڈاکٹر عبدالحئی نے مرتب کیا۔ سیرت کبریٰ مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری کی مشہور کتاب ہے۔ انداز ادیبانہ اور مواد مستند ہے۔ فقہ السیرہ کے نام سے عرب دنیا میں کئی اچھی اور مفید کتابیں بھی بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئیں۔ استاذ محمد الغزالی اور ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی نے اس موضوع پر فاضلانہ کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے نبی رحمت سیرت کے ادب میں ایک قابل ذکر کتاب ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب اگرچہ مختصر ہے لیکن استناد میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے۔ مولانا نے یہ عوام الناس کے لئے لکھی تھی۔ محمد رفیق ڈوگر کی الامین اپنی نوعیت کی ایک اچھی کتاب ہے۔ محبوب خدا مجلس احرار کے چودھری افضل حق کے قلم سے ایک مختصر کتاب ہے۔ بلاغ المبین مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھی جو تحریک آزادی ہند کے ایک اہم رہ نما تھے۔ شاہ نامہ اسلام از حفیظ جالندھری منظوم سیرت کا اردو میں بہترین نمونہ ہے۔

غیر مسلم، بالخصوص ہندو اور سکھ مصنفین میں جی ایس دارا کی رسول عربی اور سوامی لکشمن پرشاد کی عرب کا چاند قابل ذکر ہیں۔ دارا کی کتاب بہت جامع متوازن اور غیر متعصبانہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے دیباچے نے اس کے اعتبار میں اضافہ کر دیا ہے۔ سوامی لکشمن کی زبان بہت ادبی اور انداز وارفتہ ہے۔ انگریز اور فرانسیسی مصنفین نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔

مقالات کے مجموعے اور رسائل کے سیرت نمبر بھی بیسویں صدی کی ایک خاص سوغات ہیں۔ ایسے مجموعے اور خاص نمبر سیکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں میں ہیں۔ ان لاتعداد در ہائے تابندہ میں نقوش کا سیرت نمبر دور سے چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

کتب سیرت کی اشاعت کے ضمن میں دو ادارے بہت نمایاں رہے۔ ایک حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ اور دوسرا نول کشور پریس جو کہ ایک ہندو کی ملکیت تھا۔ ثانی الذکر نے بے شمار اسلامی کتابیں نہایت ادب سے چھاپیں، شاید اسی کا ثمر تھا کہ نول کشور کا بیٹا اسلام لے آیا تھا۔

باب دوازدہم: مطالعہ سیرت، مستقبل کی ممکنہ جہتیں

محاضرات کے سلسلے کے اس آخری مضمون میں گزشتہ گیارہ مضامین کو پیش نظر رکھتے ہوئے مستقبل کے لئے سیرت پر کام کے حوالے سے گذارشات پیش کی جائیں گی۔ مطالعہ سیرت کے اس جائزے میں جو باتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں ان میں سب سے پہلا تصور جو اہمیت کا حامل ہے وہ معلومات سیرت کے ذخیرے کا مستند اور قابل اعتماد ہونا ہے۔ سیرت نگاروں اور محدثین نے صحابہؓ کے ادوار سے اس ذخیرہ روایات کو محفوظ کرنے میں اتنی عرق ریزی سے کام لیا ہے کہ ٹھوس علمی بنیادوں پر کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکا۔ دوسری اہم بات اسی پیش کردہ تصور سے منسلک ہے کہ روایات کی کثرت سے گو بعض کم زور روایات بھی اس ذخیرے میں شامل ہوگئیں لیکن یہ روایات سیرت کے اساسی ذخیرے پر اثر انداز نہیں ہوئیں اور ان کی حیثیت فروعی مسائل کی ہے۔ یعنی اگر یہ معلومات نہ بھی ہوتیں تو سیرت کے علم میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں سیرت کے ذخیرے کو جزئیات کی حد تک پھیلا دینا اصل میں مسلمانوں کی اپنے نبی ﷺ سے عقیدت کا مظہر ہے۔ سیرت کو مرتب اور منضبط کرنے کے اس عمل نے رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات کو رہتی دنیا تک کے لئے ایک زندہ حقیقت بنا ڈالا، جس سے انکار کا کسی کو یارا نہیں۔ تیسری بات جو مطالعہ سیرت سے منظر عام پر آتی ہے وہ مسلمانوں کا سیرت نگاری سے مسلسل اور غیر منقطع اعتنا ہے۔ اسلامی تاریخ کا کوئی ایک دور یا کسی دور کا ایک مختصر سا حصہ بھی ایسا نہیں جس میں مسلمان اپنے نبی ﷺ کی سیرت سے بے بہرہ رہے ہوں۔ اسی چیز نے امت کو بھی ایک تسلسل بخشا ہے یعنی شروع سے آج تک صدیاں گزر جانے کے باوجود امت کم وبیش ان ہی فکری خطوط پر قائم ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے قائم کیا تھا۔ عملی طور پر امت ضرور بھٹکاؤ کا شکار ہوئی لیکن مجموعی تاثر دوسروں سے مختلف اور ممیز ہی رہا۔ اگر ایسا ہو کہ آج رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لے آئیں تو وہ فوراً پہچان لیں گے کہ ان کی امت کے لوگ کون ہیں جب کہ دیگر انبیا میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں کہ جو اپنی شریعت پر عمل پیرا لوگوں کی نشان دہی کر سکے۔ اس سارے تناظر کے پیش نظر اس مضمون میں تین باتوں کا جائزہ لے کر سیرت نگاری کی ممکنہ جہتوں کے بارے میں سفارشات پیش کی جائیں گی۔ پہلی بات رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا موجودہ تناظر ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے کیوں اہم ہے۔ دوسری بات اہل مغرب کا سیرت کے حوالے سے مطمع نظر ہے اور تیسری بات مسلمان اہل علم کی سیرت کے حوالے سے ذمے داریاں ہیں۔

مسلمانوں کا ایک امت ہونا رسول اللہ ﷺ کی ذات کا رہین ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے یہودی اور عیسائی بھی منحرف نہیں بل کہ یہودی تو مسلمانوں کے سے سخت پیرائے میں اللہ کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی شناخت کو ختم کرنے یا اسے دھندلانے میں اہل مغرب کا واحد ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔ مختلف طریقوں سے ان کی ذات پر رکیک حملے ایک منصوبے کا حصہ ہیں، جو مسلمانوں کی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کا امتحان لینے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ یہ امتحان اس نصاب کے ضمن میں لیا جاتا ہے جسے دنیا سیکولرزم کے نام سے جانتی ہے، جس سے مراد سیاسی، معاشرتی اور معاشی امور سے الٰہی ہدایت کو بے دخل کر کے اسے مسجد تک محدود کرنا ہے جیسے کہ اہل مغرب نے اپنے ہاں اسے چرچ تک محدود کر دیا۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ مسلمان کب اس نصاب کو مکمل طور پر اپناتے ہیں، یعنی کب وہ مرحلہ آئے گا جب وہ اپنے پیغمبر کی گستاخی پر مضطرب نہیں ہوں گے۔ لیکن جو چیز مسلمانوں کی زندگی سے مذہب کو الگ نہیں ہونے دیتی وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سیرت ہی ہے۔ کیوں کہ انہوں نے ایک نبی اور پیغمبر ہوتے ہوئے زندگی کے تمام امور میں نہ صرف مکمل رہ نمائی پیش کی بل کہ بہ ذات خود اس میں عملی حصہ ڈالا اور اسی سے سیرت کا تصور ابھرا کہ وہ طرز عمل جو رسول اللہ ﷺ نے مختلف دنیوی امور میں اپنایا۔ بل کہ سیرت کی اولین تعریف تو رسول اللہ ﷺ کا دیگر قوموں کے ساتھ معاملہ طے کرنا ہی تھا، بعد میں سیرت کا تصور وسعت اختیار کر گیا۔ اس طرح سے امت کا تصور سیرت سے مربوط ہے۔ یہ صرف تصور کی حد تک نہیں بل کہ اسلام میں امہات المومنین کو مومنوں کی مائیں قرار دے کر اور عربی زبان سے محبت کی ترغیب دے کر مسلمانوں کو ایک ماں کی اولاد سمجھا گیا جس کے روحانی بات خود رسول اللہ ﷺ ہوئے اور اس طرح سے عربی ان کی مادری زبان ہوئی۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ معاملہ محض سیرت پر علمی کارنامے سامنے لانے تک محدود نہیں بلکہ ذات رسالت مآب ﷺ سے گہری دلی وجذباتی وابستگی تک پھیلا ہوا ہے۔

جہاں تک دور حاضر میں مسلمانوں کا سیرت کے بارے میں طرز عمل ہے تو وہ بھی ایک طرح سے اہل مغرب کی فکری وثقافتی یلغار کا ایک ردعمل ہے۔ مسلمانوں کی ذات رسالت مآب ﷺ سے جذباتی وابستگی تو اس قدر ہے کہ مغرب اپنی برتری کی بنا پر تمام تر ہتھکنڈے استعمال کرنے کے باوجود ان کے دلوں سے یہ وابستگی کم نہیں کر سکا، لیکن مسلمانوں میں علمی روایت کے کم زور پڑ جانے سے یہ ردعمل مغرب کے حملوں کا اثر زائل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس سلسلے میں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ مسلمانوں میں

علم کی روایت کیوں کم زور پڑی تو اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں میں مغربی طرز تعلیم کا مقبول ہونا تھا۔ مسلمان ممالک میں آزادی کے بعد بھی صرف وہی شخص عہدے اور منصب کا اہل ہے جو مغربی طرز کے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو۔ مدارس کے پڑھے لوگوں کو جو اسلام کے روایتی نظام تعلیم کے نمائندہ ہیں، کسی لائق نہیں جانا جاتا۔ اس چیز نے لوگوں کا رجحان مکمل طور پر مغربی طرز تعلیم کی طرف پھیر دیا جس سے کہ اسلام کا روایتی تعلیمی نظام ایک غیر اہم اور فرسودہ چیز قرار پایا۔ مغرب کا نظریہ علم چوں کہ مذہب کی عملی زندگی میں شمولیت کے انکار پر مبنی ہے لہٰذا یہ مسلمانوں کی مذہب سے وابستگی کو کم کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔ یہ تو مدارس سے وابستہ لوگوں کی تگ ودو ہے کہ انہوں نے سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باوجود مسلم عامۃ الناس کو ابھی تک دین سے جوڑ رکھا ہے، ورنہ مسلم دنیا کب کی مکمل طور پر یورپ کے رنگ میں رنگی جا چکی ہوتی۔ لیکن مغربی نظام مسلسل اپنا رنگ جمانے میں مصروف ہے۔ یہ اثر ضرور پیدا ہو چکا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے بھی وہی تحقیق قابل قبول ہوتی ہے جو لوگوں نے مغرب کی درس گاہوں میں بیٹھ کر کی ہو۔ مدارس کی تعلیم پر ان کا یک سر اعتماد نہیں ہے۔ لہٰذا جس جس چیز پر مغرب نکتہ چینی کرتا ہے وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نزدیک بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے پہل مستشرقین نے قرآن کی حیثیت پر اعتراضات کئے تو جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے قرآن کی روایتی تشریح پر شک کا اظہار کیا جو ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ قرآن کی ایسی تشریح کو قابل قبول مانا جاتا ہے جو سائنس کے موافق ہو، حال آں کہ کہ سائنس کا اصول ہی یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز حتمی نہیں جب کہ قرآن پر ہمارا ایمان یہ ہے کہ اس کی ہر بات حتمی ہے، پھر اسے سائنس سے ثابت کرنے کا کیا مطلب؟ اسی طرح مستشرقین نے حدیث کی استنادی حیثیت پر اپنے اعتراضات کا سلسلہ دراز کیا تو مغرب زدہ طبقے نے اسے فوراً قبول کر لیا اور آج ایک بڑا طبقہ بڑی آسانی سے کسی بھی حدیث پر اپنے شک کا اظہار کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک حدیث اخباری رپورٹروں کی خبروں کی مانند ہے، جس میں لگی لپٹی کا شامل ہونا ایک عام سی بات ہے۔ مسلمانوں میں فقہ کی روایت ایک بڑے مربوط علم کی ہے جس پر ہزاروں مسلم اہل علم نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا ڈالیں۔ فقہ کی کتابوں میں آنے والے فیصلے اور فتاویٰ اپنا ایک پس منظر رکھتے تھے۔ جب ان فیصلوں کو جدید تناظر میں پڑھا جاتا ہے تو وہ بالکل ایک مختلف تصور پیش کرتے ہیں، جس سے جدید ذہنوں کو ایک گھن سی آتی ہے جس طرح سے بنا سپتی کے عادی لوگوں کو دیسی گھی سے آتی ہے۔ اس ماحول میں فقہ کو ایک فرسودہ چیز قرار دینا کچھ مشکل نہ تھا اور عملاً ایسا ہو رہا۔ اس سارے پس منظر میں سیرت کے

بارے میں یہ تصور پروان چڑھانا کہ یہ علم مسلمانوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کو idealize کرنے کے لئے قائم کیا کتنا مشکل ہوسکتا تھا؟ یہ صورت حال مسلمان اہل علم کے لئے ایک بہت بڑی مبازرت ہے، جس سے انہوں نے عہدہ برآ ہونا ہے۔ (۲۰۲)

اس سلسلے میں کرنے کا اولین کام اپنی فکری بنیادوں اور نظریۂ علم کو اپنے اوپر واضح کرنا ہے جو جدید اثرات کے تحت نظروں سے اوجھل ہوگئے یا دھندلا گئے ہیں۔ اس کے لئے اسلامی تاریخ اور علوم کے بغور اور گہرے مطالعے کی اشد ضرورت ہے، جس کے لئے عربی زبان کی تحصیل ایک لازمی امر ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیکولرزم کے ارتقا کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے، تاکہ ہم پر یہ واضح ہو سکے کہ وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے مغربی دنیا کو مذہب سے ہٹا کر اس راہ پر لگا دیا۔ (۲۰۳) یہ اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ مغربی ذہنوں سے ان اصطلاحات میں ہی بات کی جائے جنہیں وہ مستند سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کے فکر کے تضادات کو ان پر واضح کیا جائے، تاکہ مسلمانوں پر سے اس کا طلسم ٹوٹے۔

سیرت کے حوالے سے جس لائحہ عمل کو مسلمان اختیار کر کے مغرب کی علمی یلغار کے آگے بند باندھ سکتے ہیں وہ ایک سے زیادہ نوعیت کا ہوسکتا ہے۔ اس میں سب سے اہم کام روایات کی تخریج کا ہے جس میں مستند اور غیر مستند چیزوں کو الگ کر کے ایک ایسا جامع مجموعہ مرتب کیا جائے، جس سے لوگوں کو آسانی ہو کہ صحیح اور غیر صحیح پر مطلع ہوسکیں، اور اس طرح سے شبہات سے بچ سکیں۔ (۲۰۴) استنادی حیثیت کو محدثین کرام طے کر چکے اب ضرورت انہیں ایک مجموعے کی شکل دینے کی ہے، تاکہ عام قاری کو ایک ہی جگہ یہ مواد دست یاب ہو جائے۔ اسی طرح سے اصول درایت کو مزید ترقی دی جائے، جس میں کسی روایت کے داخلی شواہد کو پیش نظر رکھ کر کوئی نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ مغربی ذہنوں کو مخاطب کرنا بھی مقصود ہے لہٰذا جدید طرز تحقیق کا سہارا بھی لیا جاسکتا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ (۲۰۵) خاص طور درایت کے معاملے میں ہمیں علمائے اصول کے منہج کو ہی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ روایت اور درایت کا ایسا امتزاج جس میں ایک توازن ہو عصر حاضر کے سیرت نگاروں کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

ماضی میں علمائے اسلام نے مشکل القرآن اور مشکل الحدیث کے نام سے فنون مرتب کئے، جس کا مقصد قرآن اور حدیث کے ان معرکۃ الآرا مسائل کا مطالعہ کرنا مقصود تھا، جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان ہی خطوط پر مشکل السیرہ کے فن کو بھی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ (۲۰۶)

مشینی تناظر میں سوچیں تو راویوں کا ایک ایسا کمپیوٹر پروگرام تیار کیا جاسکتا ہے، جس سے ہر راوی

کی حالات تک رسائی انگلیوں کی جنبش تلے آجائے گی۔ اسی طرح کمپیوٹر اور دیگر مشینوں سے وہ چیزیں جو کبھی ممکن نہیں تھیں آج ممکن ہو چکی ہیں۔ خاص طور پر مخطوطوں اور ماخذوں کا ہر جگہ دست یاب ہونا۔ اب کسی کو لائبریری اٹھا کر لانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ بڑی بڑی لائبریریوں کا مواد چند سی ڈیز پر آجاتا ہے۔ اسی طرح اداراتی کاوشوں کے ذریعے سیرت پر دائرہ معارف تیار کئے جاسکتے ہیں، جو کتابی شکل میں بھی ہوں اور ان کی کمپیوٹر پروگرامنگ بھی ہو جو سی ڈی یا ڈی وی ڈی کی شکل میں دست یاب ہو۔

عصر حاضر میں سیرت پر ایک اور اداراتی نوعیت کا کام ایسا ہے جو اتحاد امت میں بھی مد ثابت ہوسکتا ہے۔ اہل علم کی ایک ایسی جماعت ہو جو دنیا کی مختلف زبانوں میں مہارت رکھتی ہو۔ وہ اس کام کو اپنے ذمے لیں کہ دنیا میں جس جس زبان میں بھی سیرت پر کام ہو رہا ہے اسے ایک یا ایک سے زیادہ بین الاقوامی سطح کی زبانوں میں ترجمہ کریں، تاکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے مطالعے میں آسکیں۔ اس طرح سے ایک جگہ کے مسلمان رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے دوسرے مسلمانوں کے جذبات سے آگاہی حاصل کریں گے، جو ان کے باہمی قرب کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوگا۔

گزشتہ ابواب میں جن علوم سیرت کا تذکرہ ہوا ہے ان کی تفصیلی بحث میں جا کر انہیں واقعتاً علوم کی شکل دینے کی ضرورت ہے، جس سے سیرت ایک منظم مطالعے کی شکل میں نصاب کا حصہ بن سکے۔ یہ عمل سیرت کو تعلیمی میدانوں میں لاکر مسلمان طلبہ کے لئے سوچ کے نئے زاویے متعین کرے گا۔

حواشی اور حوالہ جات

۱۰۹۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حُرِّمَ مَابَیْنَ لَابَتَیِ الْمَدِیْنَۃِ، صحیح بخاری، باب حرم المدینہ، جز ۶

۱۱۰۔ ہجرت کے بعد مدینے میں کوئی اطم قائم نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ اسلامی ریاست کے قیام سے مدینے میں ایک مرکزیت قائم ہوگئی اور آپس کے خطرات تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ اب جو بھی خطرہ تھا وہ مجموعی تھا۔

۱۱۱۔ علامہ نور الدین سمہودی نے وفاالوفا میں بہت سی قیمتی معلومات ان سب باتوں کے بارے میں دی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مدینے میں کون کون سی آبادیاں قیام پذیر تھیں۔ بستیوں کے نام کیا تھے۔ ان میں کون کون سے خاندان رہتے تھے۔ کھیتیوں اور باغات کی حدود کیا تھیں۔ ان باغات میں کیا چیز کاشت ہوتی تھی۔ کھجوریں کس قسم اور کس سطح کی تھیں۔ کون شخص اپنی کھجوروں کو کس بازار میں فروخت کرتا تھا وغیرہ۔

۱۱۲۔ مختلف مہاجر صحابہ بھی اسی طرح مدینے کے طول وعرض میں آباد ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا مکان بھی مسجد

نبوی سے ساڑھے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، لہٰذا جب قرب وفات رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو حضرت ابوبکرؓ نے گھر جانے کی اجازت چاہی کیوں کہ وہ کئی دنوں سے گھر نہیں گئے تھے۔ یہ قبا کے قریب عوالی نامی ایک بستی تھی، جس میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے سخ کہتے تھے۔ یہاں ان کے قیام پذیر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یہاں ایک انصاری خاتون خارجہ بن زید سے شادی کر لی تھی۔

۱۱۳۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اكْتُبُوْا لِيْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ فَكَتَبْنَا لَهٗ اَلْفًا وَّخَمْسَ مِائَةِ رَجُلٍ، صحیح بخاری: باب کتابۃ الامام الناس، جز ۱۰

۱۱۴۔ فَاِنَّ هٰذَا الْحَيَّ مِنَ الْاَنْصَارِ يَقِلُّوْنَ وَيَكْثُرُ النَّاسُ، صحیح بخاری، باب من قال فی الخطبۃ بعد الثناء، جز ۳

۱۱۵۔ عمر بن الحموع جو بڑے مشہور صحابی تھے ان کے بت کا قصہ تقریباً تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان ان کے بت کو گندا کر دیا کرتے تھے اور وہ اسے روزانہ صاف کرتے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ نوجوان صحابی نے وہ بت اٹھا کر باہر گندگی پر پھینک دیا جس سے متاثر ہو کر عمرو مسلمان ہو گئے۔

۱۱۶۔ بنو قینقاع کا ایک قبیلہ ایک الگ گاؤں میں آباد تھا جو سنار کا کام کرتا تھا۔ ان میں تین سو سنار تھے جو مدینے اور قرب وجوار میں اپنی مصنوعات فروخت کرتے تھے۔

۱۱۷۔ تورات میں آج بھی لکھا ہوا ہے کہ مفتوحین کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ قتل ہونے والوں کی تعداد کیا تھی اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس بات کی طرف البتہ اشارہ ملتا ہے کہ تمام کے تمام جنگی مردوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ خود قرآن میں سورہ احزاب کی یہ آیت تقتلون فریقا وتاسرون فریقا (تم ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور ایک گروہ کو گرفتار کر رہے تھے) بڑا واضح اشارہ ہے۔ مقتولین کی تعداد ۲۵ سے ۶۰۰ تک بیان کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب Muhammad and the jews of medina ہے، جسے برکات احمد قادیانی نے تحریر کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ رسول اکرم اور یہود حجاز کے نام سے موجود ہے۔

۱۱۸۔ جب حضرت سعدؓ کو حکم بنایا گیا تو انہوں نے اصرار سے تین مرتبہ حاضرین سے دریافت کیا کہ کیا سب لوگ ان کے فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اقرار ہوا جس کے کہ وہ متمنی تھے تو انہوں نے اپنا فیصلہ صادر فرمایا۔

۱۱۹۔ غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، جس میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کے درمیان پانی کے معاملے بن بدمزگی ہو گئی جو سفر کی تکان کے باعث ایک عام سی بات تھی۔ اس پر عبداللہ بن ابی نے انصار کی عصبیت کو ہوا دی اور دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے کی حمایت پر آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس خطرے کا فوراً سد باب فرمایا اور وہاں سے کوچ کا حکم دیا، تاکہ لوگ سفر کی تیاری میں لگ جائیں۔ اس سفر کے دوران

سورہ منافقین کی آیات نازل ہوئیں، جن میں اس واقعے کا ذکر ہوا، اس طرح عبداللہ بن ابی کی چال بے نقاب ہوگئی۔

۱۲۰۔قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاحِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ وَأَيُّمَا حِلْفٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ لَمْ يَزِدْهُ الْإِسْلَامُ إِلَّا شِدَّةً، صحیح مسلم: باب مواخاۃ النبی ﷺ، جز ۱۲

۱۲۱۔خیبر مدینے کے شمال میں ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ایک سرسبز اور زرخیز جگہ ہے۔خیبر اور اس کے مضافات میں سات بڑے قلعے تھے جن کو حصون کہا جاتا تھا۔یہ مدینہ کے اطام سے بڑے اور زیادہ مضبوط تھے۔فدک خیبر شمال مشرق میں تیس پینتیس میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں پر بھی ایک بڑا قلعہ تھا۔

۱۲۲۔اَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِخْرَاجِ بنی النظیر من المدینة جلاء ہ ناس منهم فقالوا یارسول الله انك أمرت باخراجهم ولهم على الناس دیون لم تحل فقال النبی صلی الله علیه وسلم ضعوا وتعجلوا أو قال وتعاجلوا، سنن الکبریٰ للبیہقی: جز ۶۔اس پر فقہا کی بحثیں ہیں جس میں غالب رجحان یہ ہے کہ چوں کہ یہ ہدایت سود کی حرمت سے قبل کی تھی اس لئے اب اس پر عمل ساقط ہے۔

۱۲۳۔یہ زمینیں یہودیوں کے قبضے میں اس لئے نہیں دی جاسکتی تھیں کہ اس طرح سے ان کا مدینے سے رابطہ قائم رہتا اور وہ یہاں سازشیں کرسکتے تھے۔دوسرا یہ کہ یہ زمینیں ویسے بھی یہودیوں نے مختلف سودی ہتھکنڈوں سے ہتھیالی تھیں۔

۱۲۴۔ان میں سے ایک عمدہ زمین کا قطعہ حضرت عمرؓ کے حصے میں آیا تو انہوں نے صدقہ کردینا چاہا۔رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کی کہ اس کی آمدنی وقف کردو، تاکہ اصل ملکیت موجود رہے اور ضرورت مندوں کو اس کا فائدہ ہوتا رہے۔یہ اسلام میں دوسرا وقف تھا جب کہ پہلا وقف خود رسول اللہ ﷺ نے کیا جب بنونضیر کے ایک یہودی مخیریق نے اپنی جائیداد کو ایک وصیت کے تحت رسول اللہ ﷺ کو دے دیا، جسے آپ نے اسلامی ریاست کے لئے وقف کردیا۔

۱۲۵۔حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کبھی کئی دن تک گندم استعمال نہیں کیا تھا اسی ضمن میں ہے کہ قوت خرید سے باہر ہوجاتا تھا۔ قَالَتْ مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍصلی الله علیه وسلم مِنْ خُبْزِبُرٍّ مَأْدُوْمٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ حَتّٰى لَحِقَ بِاللّٰه، صحیح بخاری: ما کان السلف یدخرون فی بیوتهم، جز ۷

۱۲۶۔اس بات کا بین ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد مسلمان ابھی تنگ دستی کے عالم میں تھے تو یہودیوں کا ایک بڑا تجارتی قافلہ مدینے آیا جس میں جواہرات اور موتی تھے۔مسلمان خواتین اور نوجوانوں نے حسرت کی ایک نظر سے ان کی سمت دیکھا اور دل میں محسوس کیا کہ تمام مال و دولت یہودیوں کے پاس ہے۔اس

وقت مسلمانوں کی تسلی کے لئے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِيْ۔ (ہم نے آپ کو قرآن اور سات مثانی عطا کئے ہیں جو بہت بڑی نعمت ہیں۔ الحجر: ۸۷)

۱۲۷۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى اَنْ تُتَلَقَّى السِّلَعُ حَتّٰى تَبْلُغَ الْاَسْوَاقَ، صحیح مسلم: باب تحریم تلقی الجلب، جز ۸۔ دوسری روایت کے مختلف متن ہیں جو ذیل میں دیئے جارہے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ وَلَايَبِعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ، صحیح بخاری: باب هل يبيع حاضر لباد بغير اجر، جز ۷۔ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَايَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَاِنْ كَانَ اَخَاهُ اَوْ اَبَاهُ، سنن ابی داود، باب فی النھی ان یبیع حاضر لباد، جز ۹۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ، جامع ترمذی: باب ماجاء لايبيع حاضر لباد، جز ۳

۱۲۸۔ پاکستان میں دست کاری کے بعض عمدہ نمونے دیہات کی خواتین بناتی ہیں جو یورپ میں ہزاروں ڈالر بکتے ہیں لیکن ان خواتین کو چند روپے سے زیادہ معاوضہ نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان خواتین کی مارکیٹ تک رسائی نہیں ہے۔

۱۲۹۔ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نهى عن بيع الكالى، سنن الکبری للبیہقی: جز ۵

۱۳۰۔ أبشر، فان الجالب الىٰ سوقنا، كالمجاهد فى سبيل الله، والمحتكر فى سوقنا، كالملحد فى كتاب الله، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: جز ۵

۱۳۱۔ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَالْوَزْنُ وَزْنُ اَهْلِ مَكَّةَ، سنن النسائی: باب کم الصاع، جز ۸

۱۳۲۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَبِيْعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ اِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ وَالْفِضَّةَ بِالْفِضَّةِ اِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ وَبِيْعُوْا الذَّهَبَ بِالْفِضَّةِ وَالْفِضَّةَ بِالذَّهَبِ كَيْفَ شِئْتُمْ، صحیح بخاری: باب بيع الذهب بالذهب، جز ۷

۱۳۳۔ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا حِمَى اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ، صحیح بخاری: باب لاحمی الا اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم، جز ۸۔ ایسی ہی چراگاہ ایک وہ تھی جہاں بنی عرینہ کے چند لوگوں نے جو کہ وہاں رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بہ غرض آب وہوا کی تبدیلی رہ رہے تھے، وہاں مامور صحابی کو قتل کردیا۔ آپ نے ایک دستہ ان کے گرفتار کرنے کو روانہ کیا جو انہیں مدینہ واپس لایا جہاں انہیں سزائے موت دے دی گئی۔

۱۳۴۔ امت مسلمہ نے سب سے زیادہ امام غزالی کے اثرات کو قبول کیا۔ وہ بہ یک وقت اخلاقیات، روحانیات، فقہ اور اصول فقہ، عقلیات، منطق اور فلسفہ سب کا ایک مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرتے تھے اور ان سارے

علوم وفنون کے دلائل سے کام لے کر اسلامی عقائد کی توضیح اور ان پر اعتراضات کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۱۳۵۔ وہ ترتیب تھی مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ ان چاروں چیزوں کی حالت پر اس نے یہ استدلال قائم کیا کہ چیزیں اپنے مبدا کی طرف لوٹتی ہیں۔ لہٰذا پانی مٹی کے اوپر بہتا دکھائی دے گا اور کبھی مٹی کے نیچے نہیں جائے گا (ظاہری مشاہدے کے مطابق)۔ اسی طرح ہوا پانی سے اوپر رہے گی اور آگ ہمیشہ اوپر کی طرف جائے گی، کیوں کہ دیوتا اسے آسمان سے زمین پر لائے تھے اور اس وقت کے خیال کے مطابق کائنات کے تمام اجرام آگ سے بنے ہوئے تھے۔ یہ تصور پندرہ سو سال سے زیادہ قائم رہا، حتیٰ کہ نیوٹن نے کائنات کی توجیہ کے لئے نئے اصول وضع کر لئے (م رت)۔

۱۳۶۔ صوفیا نے اپنے غور وفکر سے رسول اللہ ﷺ کی ذات پر گفت گو کی اور اس ضمن میں حقیقت محمدی اور نور محمدی کے مباحث بہت اہمیت کے حامل ٹھہرے۔ اس کے علاوہ مختلف انبیا کی نسبتیں متعین کرنا بھی صوفیا کا خاص میدان رہا ہے خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی دیگر انبیا پر اخلاقی برتری کو صوفیا نے بڑے نفیس اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن صوفیا نے اپنے وجدانی مشاہدات میں غلو کے باعث کچھ عجیب وغریب نتائج بھی برآمد کئے۔ مثلاً یہ کہ ولایت نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ انبیا کے لئے اس بات کی تطبیق انہوں نے اس طرح سے کی کہ ہر نبی چوں کہ ولی بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے، اس طرح وہ ایک امتی ولی سے افضل ہوتا ہے۔ مجدد الف ثانی نے اس کا رد کیا اور اسے صوفی کے وجد وسکر کی غلطی قرار دیا۔ اپنے مکتوبات میں انہوں نے نبوت کے بارے میں تمام عقلی اور غیر عقلی الجھنوں کو صاف کر دیا۔ مکتوبات کے علاوہ نبوت کے اثبات کی بحث کے لئے انہوں نے اثبات النبوۃ کے نام سے علیحدہ رسالہ بھی تحریر کیا۔ انہوں نے کہا کہ کمالات نبوت کی حیثیت ایک دریائے بسیط کی ہے اور کمالات ولایت کی حیثیت اس کے مقابلے میں ایک حقیر قطرے کی ہے۔

۱۳۷۔ وسیع معنوں میں اسے یورپ کی تحری رومانیت پر قیاس کیا جا سکتا ہے جو عقلیت پسندی کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔

۱۳۸۔ نبی کا لغوی معنی خبر دینے والا ہے جب کہ اصطلاح میں اس سے مراد اللہ طرف سے بڑی خبریں دینے والا ہے۔ ورش کی قرأت میں اسے ہمزہ کے ساتھ اور حفص کی قرأت میں بغیر ہمزہ کے پڑھا جاتا ہے۔ اس کا ایک دوسرا مادہ نبوہ بھی ہے جس سے مراد بلند مرتبہ شخصیت کے ہیں۔ ابونعیم نے دلائل نبوت (تعارف آگے آرہا ہے) میں لکھا ہے، نبوت ایک سفارت ہے جو اللہ اور اللہ کی ان مخلوقات میں جو صاحب عقل ہوں ان کے درمیان پیغام رسانی سے عبارت ہے۔ مفسرین اور متکلمین میں اختلاف رہا ہے کہ نبی اور رسول میں کیا فرق

ہے۔شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے مطابق نبی وہ ہے جس کو وحی ملے اور رسول وہ ہے جس کو نئی کتاب یا نئی امت یا نئی شریعت یا تینوں دی جائیں۔

۱۳۹۔نبوت کی ضرورت واہمیت سیرت کی بہ جائے خالص علم کلام کا موضوع ہے جس پر پچھلے اوراق میں کچھ ارشارہ ہو چکا۔مختصراً اس میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ نبی یا رسول کا بنیادی مقصد انسان کی اخروی نجات سے متعلق ہدایات فراہم کرنا ہوتا ہے جسے انسانوں کو اپنی زندگی میں اپنانا ہوتا ہے۔جہاں تک دنیاوی ضروریات کا تعلق ہے تو انسان کی عقل اس کے لئے کافی ہے کہ وہ اپنی دنیاوی ضروریات کو فراہم کر سکے۔ہر دور میں انسان دنیاوی ضروریات سے اپنی عقل کی بہ دولت بہ خوبی عہدہ برآ ہوتا رہا ہے لیکن اپنی اخروی نجات کی راہ تلاش کرنے کے لئے وہ ایک نبی کا محتاج ہے۔

۱۴۰۔پیغمبر اسلام ﷺ نے دنیا میں جس واضح تبدیلی کی داغ بیل ڈالی وہ علم کا فروغ تھا جس نے دنیا کے عام انسانوں کے لئے علوم کے دروازے کھول دیئے جب کہ اس سے قبل مذہبی علم ایک خاص گروہ کی اجارہ داری ہوتی تھی۔علاوہ ازیں توہمات کے باعث انسانوں پر تحقیق کے دروازے بند تھے۔اسلام نے مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کے بعد کو ختم کیا اور ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جہاں تمام رویے اپنے حسن کے ساتھ پروان چڑھے۔اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے علم نافع کی دعا مانگی اور علم ضار سے پناہ مانگی۔لہٰذا علوم کے معاملے میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے علوم میں نقل اور عقل میں توازن نہایت ضروری چیز ہے تاکہ لوگوں کی رہ نمائی صرف علم نافع کی طرف ہی ہو سکے۔

۱۴۱۔عام طور پر اسے صرف خلاف عادت یا خرق عادت کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے،لیکن جاننا چاہئے کہ کائنات میں بہت سے کام خلاف عادت ہوتے ہیں لیکن انہیں معجزہ نہیں کہا جاتا،کیوں کہ وہ روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔لہٰذا خلاف عادت کے ساتھ اس کا معمول سے ہٹا ہونا بھی ضروری ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال خود انسانی پیدائش کا ابتدائی عمل ہے (زائیگوٹ میں اضافے کے عمل کا محرک) جسے میڈیکل سائنس بھی سمجھنے سے قاصر ہے لیکن کوئی بھی اسے معجزہ نہیں کہتا کیوں کہ یہ معمول کا امر ہے۔اسی طرح ایک عام شخص کمپیوٹر اور اس طرح کی دیگر ایجادات کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے لیکن یہ اس کے لئے معجزہ نہیں کیوں کہ وہ انہیں مسلسل استعمال کر رہا ہے (م رت)۔

۱۴۲۔فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس:۱۶) قرآن کا انکار کرنے پر اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بات کہنے کی ہدایت کی کہ میں تمہارے اندر رہا ہوں اور تم جانتے ہو کہ میں نے یہ سب کہیں سے نہیں سیکھا بل کہ یہ وحی ہے۔

۱۴۳۔ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ (القصص:۵۱) ''کیا یہ ان کے کافی نہیں کہ ہم نے کتاب اتاری جسے ان پر پڑھا جاتا ہے''۔

۱۴۴۔ بعض حضرات نے کمپیوٹر پر قانون میراث کو فیڈ کیا ہے۔ ایسے پروگراموں میں کروڑوں کے حساب سے میراث کی ممکنہ صورتوں کو ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۴۵۔ ابن قیم نے اپنی کتاب زاد المعاد میں اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان احادیث کو جو اسرا اور معراج کو خالص جسمانی واقعہ قرار دے رہی ہیں کی تطبیق ان احادیث سے کریں جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن میں ان کو روحانی واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خواب میں اسرا کا ہونا اور روح کے ساتھ یعنی جسم کے بغیر اسرا کے ہونے میں فرق کیا جائے۔ یہاں علامہ ابن قیم نے نفس اور روح کے مسئلہ پر بہت نفیس اور عمدہ بحث کی ہے۔ انہوں نے اس بحث کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انبیا علیہم السلام کے جسموں کا ان کی روح سے کیا اور کس نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ انہوں نے نفسیات، روحانیات، کلام اور فلسفہ مذہب کا ایک نفیس امتزاج پیش کیا ہے۔

۱۴۶۔ اللهم علمه التأويل وفقهه في الدين واجعله من أهل الايمان، المستدرک علی الصحیحین للحاکم: باب ذکر عبداللہ بن عباس

۱۴۷۔ صحیح بخاری: باب الاستسقاء في الخطبة يوم الجمعة

۱۴۸۔ جب اس واقعے پر سلطان محمد فاتح کو کہا گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق بہترین امیر ہیں تو اس نے کہا کہ وہ بہترین امیر نہیں بل کہ امیر حضرت ابوایوب انصاریؓ ہیں جو پہلے لشکر کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ سلطان نے حضرت ابوایوبؓ کے مزار پر حاضری دی اور انہیں فاتح استنبول قرار دیا۔ آج بھی جہاں حضرت ابوایوبؓ کی قبر مبارک ہے اس مقام کو فاتح کہتے ہیں اور استنبول میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کو سلطان ایوب کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ استنبول انہوں نے فتح کیا۔

۱۴۹۔ صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ سے اپنی بے پناہ محبت کے باعث اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے اقوال کا تعین کریں کہ وہ کس پیرائے میں ہے۔ ان کے لئے یہ امر کافی ہوتا تھا کہ کسی چیز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمادیا ہے لہٰذا اب اسے ہر قیمت پر بجالانا ہے۔ ایک مرتبہ جمعہ کا خطبہ ارشاد کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ کچھ صحابہ مسجد میں کھڑے ہیں تو آپ ﷺ نے انہیں بیٹھ جانے کو کہا۔ اس بات کو سن کر جو صحابہ ابھی مسجد میں تشریف لا رہے تھے وہ مسجد سے باہر ہی بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں مسجد سے باہر بیٹھے رہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ کا ارشاد سنا تو بیٹھ

گئے۔آپ ﷺ نے اس پر ان کے لئے برکت کی دعا کی۔

۱۵۰۔اسی طرح غزوہ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے جہاں کیمپ لگایا وہ جگہ ایک انصاری صحابی حضرت حباب بن المنذرؓ کو جنگی نقطہ نظر سے مناسب معلوم نہ ہوئی تو انہوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ اس جگہ کیمپ لگانا کیا حکم الٰہی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہیں تو پھر حضرت حبابؓ کے مشورے پر کیمپ کو دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔

۱۵۱۔یہ تقسیم ایک مشہور فقیہ اور اصولی امام ابوالعباس احمد بن ادریس قرافی (م ۶۸۴ھ) کی ہے جنہوں نے ایک عظیم الشان اور منفرد کتاب لکھی جو دو جلدوں میں ہے۔اس کا نام کتاب الفروق ہے۔اس میں انہوں نے ایسی چیزوں کے درمیان فرق کی نشان دہی کی ہے اور غالباً ساڑھے پانچ سو فرق بیان کئے ہیں۔اس میں چھتیسواں فرق یہ تہری تقسیم ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مختلف حیثیتوں کو بیان کرتی ہے۔

۱۵۲۔دنیا میں ماضی اور حال کے دساتیر اور قوانین میں یہ قدر مشترک رہی ہے کہ ان کو منظم شکل اختیار کرتے صدیاں لگیں جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اصول قوانین بعد میں مرتب ہوئے جب کہ قوانین پر عمل درآمد پہلے سے چلا آرہا تھا۔اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے پہلے بنیادی تصورات پیش کئے اور بعد میں اس پر قوانین بنے جنہیں بڑی کامیابی سے اسلامی ریاست میں نافذ کیا گیا۔

۱۵۳۔اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل، جامع اور مستند کتاب علامہ ابن قیم کی زاد المعاد ہے، جس میں سیرت کے تمام پہلو کو ایک ایک کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔پھر ان سے جو فقہی احکامات نکلتے ہیں وہ بیان کئے ہیں۔ جو دروس اور عبرتیں کسی سبق میں پنہاں ہیں وہ بیان کی ہیں۔غزوات سے جنگی قانون کے احکامات بھی نکالے ہیں۔معاہدات اور صلح کے احکامات بھی بیان کئے ہیں۔مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کی تفصیلات سے ۳۴ فقہی مسائل بیان کئے ہیں۔

۱۵۴۔شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ملت ابراہیمی کے بقایا جات کے نام سے اس مسئلے کو نیا رخ دیا۔وہ کہتے ہیں کہ یوں تو تمام انبیا علیہم السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی تمہید تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے لئے ایک فوری مقدمہ تھی، کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے پیغمبر تھے جنہوں نے مختلف اقوام میں دین کی تعلیم دی۔اس طرح سے انہوں نے ایک عالم گیر ملت کی بنیاد رکھی جس کے باعث مسلمانوں کو ملت ابراہیمی کا پیروکار کہا جاتا ہے (ملت ابیکم ابراھیم . الحج:۷۸) لہٰذا اس چیز کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے ابراہیمؑ کی سنتوں کو از سر نو زندہ کیا۔اس میں واضح مثال مناسک حج ہیں کہ قریش نے بعض چیزوں کو ترک کر دیا تھا اور بعض چیزوں کو خود سے حج کے مناسک میں شامل کر دیا تھا۔آپ ﷺ نے

اس کمی بیشی کو ختم کر دیا۔ مثال کے طور پر دوسروں کی تجارت کی ترقی کے خطرے سے قریش نے حج میں تجارت کو ممنوع قرار دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس ممانعت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح قریش نے اپنے آپ کو دوسروں سے ممیز کرنے کے لئے مزدلفہ میں قیام نہیں کرتے تھے رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کے قیام کو ضروری قرار دیا۔

۱۵۵۔ يَسِّرَا وَلَاتُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَاتُنَفِّرَا، صحیح بخاری: باب بَعْثُ أَبِي مُوسٰى وَمُعَاذٍ إِلَى الْيَمَنِ قَبْلَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، جز۱۳، ص۲۳۹

۱۵۶۔ قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور جو زنجیریں ان پر لادی گئی ہیں وہ دور فرماتے ہیں۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف: ۱۵۷) یہ وہی چیز ہے جسے آج دنیا کچھ حوالوں سے ڈی ریگولیشن قرار دیتی ہے اور جسے ون ونڈو آپریشن کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ قوانین کے نظام کو سادہ بنایا جائے اور پیچیدہ بنا کر لوگوں کے لئے مشکلات نہ پیدا کی جائیں۔

۱۵۷۔ کچھ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ احکام میں تدریج ہے بعض درمیانی یا ابتدائی احکام کو لے کر موجودہ دور کے بعض غیر اسلامی رواجات کا دفاع کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ سود حرام ہے جو سود در سود ہو حال آں کہ سود کی اس قسم کی حرمت اس کی عمومی حرمت کا ایک مرحلہ تھی جس کے بعد اور بھی مراحل آئے۔ اس سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ تدریج کو سمجھنے کے لئے سیرت کا مطالعہ ضروری ہے اور یہ فقہیات سیرت کا میدان ہے۔

۱۵۸۔ اس سے قبل بھی یہ بات بیان ہو چکی کہ شراب کی حرمت سے قبل رسول اللہ ﷺ نے ان برتنوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا تھا جن میں شراب پی جاتی تھی۔

۱۵۹۔ يَا عَائِشَةُ لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ وَأَلْزَقْتُهُ بِالْأَرْضِ وَجَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ بَابًا شَرْقِيًّا وَبَابًا غَرِيبًا فَبَلَغْتُ بِهِ أَسَاسَ إِبْرَاهِيمَ، صحیح بخاری: باب فضل مكه وبنيانها، جز۵، ص۴۹۶

۱۶۰۔ مَنْ أَعْمَرَ أَرْضًا لَيْسَتْ لِأَحَدٍ فَهُوَ أَحَقُّ، صحیح بخاری، باب من احیا ارضا مواتا، جز۸، ص۱۴۵

۱۶۱۔ ایک اور مثال فتح مکہ کے موقع کی ہے کہ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے آپ ﷺ سے رہ نمائی لی کہ میرا خاوند کنجوس آدمی ہے کیا میں اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے لے سکتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے کافی ہو لے لیا کرو۔ اس میں بھی وہی اختلاف ہے کہ یہ ہدایت بہ طور شریعت

تھی یا بہ طور ایک عدالت کے فیصلے کے۔

۱۶۲۔اس نوعیت کی ایک اور دل چسپ مثال دمشق کی فتح ہے۔محاصرے کے دوران حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمرؓ خلیفہ نامزد ہوئے تو انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی اور حضرت ابوعبیدہؓ کی سپہ سالاری کے احکامات جاری فرمادیئے۔دونوں حضرات مختلف دروازوں پر شہر کو فتح کرنے کے لئے پڑاو ڈالے ہوئے تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے مرکز کی ہدایات سے آگاہی کو فتح تک موخر کرنے کا فیصلہ کیا۔حضرت خالدؓ اپنی طرف سے شہر میں داخل ہونے میں کام یاب ہوگئے۔رومیوں نے یہ دیکھا تو فوراً دوسرے دروازے پر موجود حضرت ابوعبیدہؓ سے معاہدہ صلح کرلیا اور وہ بھی شہر میں داخل ہوگئے۔عین شہر کے بیچ دونوں سپہ سالاروں کی ملاقات ہوئی تو معاملہ کھلا۔لیکن معاہدے کی پابندی کی رو سے آدھے شہر پر جو کہ فتح ہوا تھا مفتوح کے احکام اور بقیہ پر صلح کے احکام نافذ ہوئے۔

۱۶۳۔ برصغیر کا انگریزی متبادل Small Continent بنتا ہے جب کہ Sub Continent کے لئے برعظیم (Continent) کے حوالے سے عظیم موزوں تر متبادل ہے۔اسی طرح عربی میں اس خطے کے لئے متبادل ترکیب شبہ القارہ بھی برصغیر کا متبادل نہیں ہے۔حوالے کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب کا ترجمہ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔(م رت)

۱۶۴۔ برعظیم کی ملت اسلامیہ کی انفرادیت یہ رہی ہے کہ مسلمان یہاں کبھی بھی پندرہ فیس فیصد سے زیادہ نہیں رہے لیکن انہوں نے کام یابی کے ساتھ ہزار سال تک حکومت کی۔

۱۶۵۔اس امر کا اظہار خود دنیائے عرب کے نام ور مفسر، متکلم اور ادیب سید مفتی رشید رضا نے کیا جو مفتی اعظم مصر سید عبدہ کے شاگرد تھے۔وہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان آئے اور یہاں علوم اسلامیہ کے ضمن میں ہونے والے کام کو ملاحظہ کیا جس کے بعد انہوں نے تحریری اعتراف کیا کہ اگر برعظیم کے ہمارے مسلمان بھائی نہ ہوتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آج علم حدیث کا کیا حال ہوتا۔

۱۶۶۔علم حدیث کا بہ راہ راست مطالعہ مفقود تھا۔زیادہ سے زیادہ حدیث کی کسی کتاب کے کچھ اجزا شامل نصاب ہوتے تھے۔حدیث کی سند سے کوئی اعتنا نہیں رکھا جاتا تھا۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ ایک سلطان کے دربار میں دو علمی شخصیتوں کے درمیان اس بات پر مناظرہ ہوا کہ صوفیا کے حلقے میں جو سماع ہوتا ہے جائز ہے یا ناجائز تو ایک عالم نے ایک حدیث بیان کی کہ السماع مباح لاھلہ۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی ایسی حدیث موجود ہے اور نہ سماع کا لفظ دور نبوی میں ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔یہ کسی متاخر صوفی کا قول ہے جسے ناواقفیت کی بنا پر حدیث کا درجہ دے دیا گیا۔اسی طرح قرآن کی بھی بعض تفاسیر جو کہ متاخر مفسرین نے

لکھیں کے چند اجز اشامل نصاب کر دیئے جاتے تھے۔ ان تفاسیر میں مفسر کا سارا زور کلامی مسائل داخل کرنے پر ہوتا۔ جب کہ سیرت پر کوئی کتاب شامل نصاب نہ تھی۔

۱۶۷۔ علم نحو کی ایک کتاب کافیہ طویل عرصے سے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ عربی نحو وصرف کا مقصد بنیادی طور پر قرآن وحدیث کے ذخائر کو سمجھنا ہے۔ اگر اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد قرار دیا جائے تو وہ فضول اور لغو ہے۔ لیکن اس کتاب میں اہم بحث یہ سمجھی جاتی ہے کہ مصنف نے کوئی لفظ استعمال کیا ہے تو کیوں کیا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی تو اس پر ہفتہ بھر یہ بحث چلتی رہتی ہے کہ بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی۔ ایک ایک لفظ پر اساتذہ کی لمبی لمبی تقریریں ہوتی ہیں کہ قواعد کی رو سے وہ لفظ کیا ہے۔

۱۶۸۔ اسلام کو اپنے اندر جذب کرنے کے مقصد کے تحت وجود میں آنے والی تحریک جو مذہب کے فرق کو غیر ضروری خیال کرتی تھی۔ اس کے بعض پرچارک مسلمان ہونے کے باوجود اپنے آپ کو روایتی مسلمان خیال نہیں کرتے تھے۔ ان میں کبیر قابل ذکر ہے۔ سکھ مذہب اسی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا، جس میں ہندومت اور اسلام کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی مکمل تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب کا ترجمہ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ۔

۱۶۹۔ اکبر کے عہد تک ہجرت کو ایک ہزار سال گزر چکے تھے۔

۱۷۰۔ یہ لقب انہیں سیالکوٹ کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے دیا۔

۱۷۱۔ اسی طرح انہیں کسی نے اطلاع دی کہ فلاں بزرگ نے یہ کہا ہے اور وہ بات اسلامی عقائد کے خلاف تھی تو آپ نے لکھا، فقیر را تاب استماع امثال ایں سخن اصلاً نیست، بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت می آید وفرصت تاویل توجیہ آں نہ می دہد، ترجمہ: فقیر کو گوارا نہیں کہ اس طرح کی باتیں سنے کیوں کہ میری رگ فاروقی پھڑک اٹھتی ہے جو مجھے ان کی تاویل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت مجدد الف ثانی حضرت عمرؓ کی اولاد میں سے تھے۔

۱۷۲۔ انہوں نے اس غرض کے لئے مشکوٰۃ کی دو شرحیں لکھیں، ایک عامۃ الناس کے لئے فارسی میں **اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ** اور علما کے لئے عربی میں **لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح**۔ پہلی کتاب چار جلدوں میں ہے جب کہ دوسری کتاب دو جلدوں میں۔

۱۷۳۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ پہلا حصہ رسول اللہ ﷺ کے فضائل، کمالات اور صفات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں آپ ﷺ کے نسب، خاندان اور پیدائش کا ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں رسول اللہ ﷺ کی تمام زندگی کے واقعات وفات تک بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں آپ ﷺ کے دنیا سے

تشریف لے جانے کا ذکر اور پانچویں حصے میں آپ ﷺ کی اولاد، ازواج اور بقیہ اہل بیت کا ذکر ہے۔

۱۷۴۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ نول کشور پریس کانپور نے ۱۸۳۲ اور دوسرا نول کشور پریس لکھنو ۱۸۸۹ میں شائع کیا۔

۱۷۵۔ علامہ سمہودی کی کتاب بڑی وقیع اور عالمانہ ہے لیکن اس میں وہ عاشقانہ اور جذب کی کیفیت نہیں ملتی جو شیخ کی کتاب میں ملتی ہے۔ فارسی کے بڑے بڑے شعرا کے اشعار سے اس کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ ضمناً اس میں سیرت کے بہت سے واقعات بھی آگئے ہیں۔

۱۷۶۔ اس دور میں شاہ ولی اللہ کے علاوہ دو نام اور ہیں جنہوں نے سیرت پر کتابیں لکھیں۔ ایک علامہ جمال الدین الحسینی ہیں جو نیشاپور سے پنجاب میں آکر آباد ہوئے۔ انہوں نے روضۃ الاحباب کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سیرت پر بہترین کتاب کہا کرتے تھے، بہ شرطے کہ اسے الحاقات سے پاک کرلیا جائے۔ دوسرے شاہ ولی اللہ کے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی تھے جنہوں نے عوام الناس کے لئے سیرت پر تین مختصر کتابچے تحریر کئے۔ شاہ عبدالعزیز انہیں بیہقی وقت کہا کرتے تھے۔

۱۷۷۔ برعظیم میں قرآن کا پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا جو صوبہ سندھ کے شہر ہالہ کے ایک بزرگ مخدوم نوح نے کیا اور تراجم بھی ہوئے، لیکن انہیں وہ پذیرائی نہ مل سکی جو شاہ صاحب کے ترجمے کو حاصل ہوئی۔ شاہ صاحب کا ترجمہ مستند اور بڑا فاضلانہ ہے۔

۱۷۸۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد ابو یوسف اور امام محمد امام مالک کے شاگرد بھی ہیں۔ امام شافعی امام مالک کے شاگرد ہیں اور امام احمد امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری امام احمد کے شاگرد ہیں۔

۱۷۹۔ پہلا ترجمہ درمکنون کے نام سے شوکت علی شاہ جہان پوری نے کیا جو ۱۸۴۲ میں کانپور سے شائع ہوا۔ اس کے ہم راہ حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا۔

۱۸۰۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک قوامیس کتب تیار کرائی تھی، جس میں اس زمانے تک چھپی ہوئی اردو کی مطبوعہ کتب کی فہرست تھی۔ اس میں سیرت پر تقریباً چار سو کتابوں کا تذکرہ تھا جن میں دو سو کتابیں معجزات پر تھیں اور دو سو کے قریب میلاد نامے تھے۔

۱۸۱۔ اس کے تین ابواب ہیں، نور مبارک اور ولادت سے ہجرت تک، ہجرت سے وفات تک اور تیسرا حلیہ مبارک، اخلاق، عادات اور معجزات پر ہے۔ کتاب کا خاتمہ آپ ﷺ کی شفاعت کبریٰ سے متعلق ہے۔

۱۸۲۔ یہ مرزا غالب کے قریبی دوست تھے اور مرزا نے اپنے دیوان میں اشعار کا انتخاب ان ہی کے مشورے سے کیا تھا، جو شعر شیفتہ نکال دیتے مرزا دیوان میں شامل نہ کرتے۔

۱۸۳۔ بلاشبہ ولیم میور نے ایسی باتیں دہرائیں جو مستشرقین ایک عرصے سے کہتے چلے آرہے تھے لیکن ولیم میور نے

ان کے دلائل وشواہد پیش کئے۔

۱۸۴۔خطبات کی ترتیب اس طرح سے تھی: عرب کا جغرافیہ، عربوں کے رسوم ورواج، مذاہب عرب قبل از اسلام، یہودی یا عیسائی مذہب کو اسلام سے فائدہ ہوا یا نقصان، قدیم مصادر سیرت کا جائزہ، روایات مذہبی کا معتبر اور غیر معتبر ہونا، قرآن مجید، تاریخ مکہ واجداد آں حضرت ﷺ، نسب نامہ آں حضرت، بشارات در تورات وزبور، شق صدر اور معراج، بارہ سال کی عمر تک حضور ﷺ کے حالات۔ یہاں تک ولیم میور کی کتاب کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے۔

۱۸۵۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ میں اس کام میں بے گھر اور بے سہارا ہونے کے لئے تیار ہوں۔ جب قیامت میں کہا جائے گا کہ لاؤ اور حاضر کرو اس فقیر اور مسکین سید احمد کو جو میرے نام پر گھر بار لٹا بیٹھا تو میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے۔ (مارا آں تمغہ شاہی بس است)۔

۱۸۶۔ولیم میور نے یہ لکھا کہ بیت اللہ جو مکہ میں موجود ہے یہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا نہیں بل کہ بعد میں ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ سرسید نے قدیم کتابوں، مغربی مصنفین کی تحریروں، جغرافیہ کی کتابوں، قدیم مذہبی اور ادب کی کتابوں سے اس بات کو ثابت کیا کہ یہ وہی بیت اللہ ہے جسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ اس پر سرسید نے ایک پورا باب قلم بند کیا۔

۱۸۷۔ولیم میور کا یہ بھی اعتراض تھا کہ قریش کا کوئی تعلق اسماعیلؑ سے نہیں ہے۔ سیر سید نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک پورا باب لکھا۔

۱۸۸۔میور نے جبل فاران کے بارے میں بھی لکھا کہ یہ شام میں واقع ہے نہ کہ مکے میں۔ یہ انکار اس نے اس لئے کیا کہ تورات میں ایک جملہ آیا ہے کہ تمہارا پروردگار کوہ سینا سے ظاہر ہوا اور ساعیر کی پہاڑیوں پر وہ طلوع ہوا اور بالآخر فاران کی پہاڑیوں سے اس کا جلوہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ اب یہ صراحتاً رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیشین گوئی ہے جسے ولیم میور باطل کرنا چاہتا تھا۔ سرسید نے مغربی جغرافیے کی کتابوں سے شام کے جغرافیے کی معلومات اکٹھی کیں اور اس بات کو ثابت کیا جب فاران مکے میں ہی واقع ہے۔

۱۸۹۔سرسید نے یہ کام بڑے کٹھن حالات میں کیا تھا۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے لہٰذا پیسے دے کر انگریزی کتابوں کے ترجمے کا کام کرواتے تھے۔ ہندوستان میں اپنے دوستوں کو خط پہ خط لکھتے جس میں ان سے مختلف قسم کی معلومات منگواتے جو ہندوستان میں میسر تھیں۔ اس کام پر بہت دن لگ جاتے کیوں کہ ہاتھ سے کسی چیز کی نقل تیار کرنا ایک مشکل کام تھا۔ خطبات کے نامکمل رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سب کچھ بک جانے کے بعد اب سرمایہ نہیں رہا تھا کہ مزید خرچ کیا جاتا۔

۱۹۰۔ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن کی سالی سید امیر علی کی بیوی تھی۔

۱۹۱۔ واقعہ کربلا پر ان کی کتاب الشہادت ان کے تفرد کی غماز ہے۔

۱۹۲۔ مثال کے طور پر ایک موضوع روایت میں آنے والا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بارہ سال کی عمر میں چچا کے ساتھ شام گئے تو بصری میں ایک راہب نے انہیں دیکھ کر ابو طالب سے کہا بچے کو واپس لے جائیں یہودی اسے نقصان پہنچائیں گے۔ مستشرقین نے اس روایت کی بنا پر یہ کہانی قائم کرلی کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب اس عیسائی راہب سے سیکھا تھا۔ سیرت نگاروں نے اس پر غور کیا تو سند سے ہٹ کر اس کا داخلی تضاد سامنے آگیا۔ وہ یہ کہ ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت بلالؓ کی نگرانی میں بصری سے واپس بھیج دیا۔ حضرت بلالؓ امیہ کے غلام تھے اور اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور اگر تھے بھی تو بہت کم سن ہوں گے جس کی نگرانی میں کسی بچے کو نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس طرح سے تجزیے کی بنیاد پڑی۔

۱۹۳۔ انہوں نے تین کتابیں لکھنے کا پروگرام بنایا: مختصر، متوسط اور مفصل۔ مختصر کتاب، مہر نبوت، کے نام سے لکھی اور متوسط کتاب رحمۃ للعالمین ہے۔

۱۹۴۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع دنیا کو کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔

۱۹۵۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ادبیات سیرت کی ممتاز ترین کتابوں میں سے ہے۔

۱۹۶۔ مدراس میں ایک بزرگ تھے شیخ جمال۔ انہوں نے ایک ادارہ بنایا تھا جس کے تحت برعظیم کے مشاہیر کو بلا کر سالانہ کچھ لیکچرز کرایا کرتے تھے۔ یہاں سب سے پہلے لیکچرز سید سلیمان ندوی کے ہوئے، جو خطبات مدراس کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ اقبال کے مشہور خطبات بھی یہیں ہوئے۔

۱۹۷۔ ریاست حیدرآباد دکن جامعہ عثمانیہ میں اسلامی اور بین الاقوامی قانون کے پروفیسر تھے۔ جب بھارت نے حیدرآباد دکن پر قبضہ کیا تو ڈاکٹر صاحب اقوام متحدہ جانے والے اس وفد کے رکن تھے جنہیں حیدرآباد کے وزیر اعظم میر لائق علی خان نے اس قبضے کے خلاف اپیل کے لئے بھیجا کیوں کہ حیدرآباد اقوام متحدہ کا رکن تھا۔ جب وفد پیرس پہنچا تو بھارت کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ یہ قبضہ مکمل ہوتے ہی اقوام متحدہ اور پاکستان سمیت ساری عالمی برادری سو گئی۔ ڈاکٹر صاحب حیدرآباد کے پاسپورٹ پر سفر کر رہے تھے جسے انہوں نے اپنی وفات تک برقرار رکھا اور فرانس میں بہ طور پناہ گزین کے آباد ہو گئے۔ وہ ہر سال اپنے پناہ گزینی سرٹیفکیٹ کی تجدید کراتے تھے اور ان ہی دستاویزات پر سفر کرتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ ان کے ملک پر غیر ملکی طاقت کا قبضہ ہے اور جب تک وہ آزاد نہیں ہوتا وہ اپنے ملک واپس نہیں جائیں گے۔ وہ حیدرآباد کے آخری شہری تھے جو ۲۰۰۲ء میں انتقال

کر گئے۔

۱۹۸۔انہوں نے اس پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی The First Written Constitution World

۱۹۹۔مثال کے طور پر ایک گاؤں تھا جو اتا جہاں ایک میلہ لگتا تھا۔رسول اللہ ﷺ کے بارے میں خیال ہے کہ آپ ایک دفعہ وہاں گئے تھے۔اس چیز کی کھوج کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ نے قدیم کتابوں کو چھان مارا اور ایک جگہ یہ واقعہ مل گیا۔بہ ظاہر اس واقعے سے سیرت کے ذخیرے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، یہ چیز ان کی لگن کی غماز ہے۔

۲۰۰۔انعام کا تعین کرنے کے لئے دنیائے اسلام کی پانچ بڑی شخصیتوں کی کمیٹی بنائی گئی تھی۔برعظیم سے مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی، عرب دنیا سے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ ابن باز اور افریقی ممالک سے نائجیریا کے مفتی اعظم شیخ ابوبکر جومی۔

۲۰۱۔یہاں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے اس استدلال کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم میں فرمایا: **وازواجه امهاتهم** اس طرح ازواج مطہرات کو امت کی مائیں قرار دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ ان کی زبان عربی تھی، اس نسبت سے عربی تمام مسلمانوں کی مادری زبان ہوئی۔

۲۰۲۔مغرب سے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی ایک پیشین گوئی اور اس پر حضرت عمروؓ بن العاص کے تاثرات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سنائی گئی کہ قیامت کے قریب اہل روم کی کثرت ہو جائے گی تو انہوں نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو اس کا باعث اہل روم کی چند خصوصیات ہوں گی۔جب وہ کسی فتنے کا شکار ہوتے ہیں تو ٹھہراؤ کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں، جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو بہت جلد اس سے نکل آتے ہیں، جب انہیں جنگ میں شکست ہو جائے تو بہت جلد مقابلے کے لئے دوبارہ تیار ہو جاتے ہیں، اپنے مسکین یتیم کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں اور بادشاہوں کو ظلم سے روکنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔یہ روایت صحیح مسلم کے باب تقوم الساعۃ والروم اکثر الناس میں ہے، جز ۱۴۔اسی طرح جب حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ بحر متوسط اور بحر قلزم کو نہر سویز کی طرح کے ایک راستے سے جوڑ دیا جائے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو بنی الاصفر (روم والے) تمہارے صحنوں سے تمہاری عورتوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔یعنی ان کی ثقافت تمہارے گھروں میں آجائے گی۔لہٰذا اہل مغرب سے معاملہ کرتے ہوئے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اور صحابہ کرام کے اقوال کا مطالعہ از حد ضروری چیز ہے۔اس چیز کو مستقبلیات سیرت کے عنوان کے تحت پڑھا پڑھایا جا سکتا ہے۔

۲۰۳۔عام طور پر مغرب کی مذہب سے بے زاری کی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ کلیسا کا اپنے پیروؤں پر ظلم وستم اس کا بنا لیکن یہ ایک سادہ توجیہہ ہے۔یورپ کی تاریخ کا مطالعہ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔مثال

کے طور پر انقلاب فرانس کی وجوہات کے مطالعے میں کلیسا کا ظلم وستم کہیں نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت ایک مکمل دین ہے لیکن مذہب سے اس کی مماثلت کو ختم کرنے کے لئے اسے مذہبی اصطلاحات کا پیرہن نہیں پہنایا گیا۔ جدیدیت کو قائم کرنے کے لئے اس کے پیغمبروں نے بڑی جدوجہد کی ہے اور وقت پڑنے پر قربانیاں بھی پیش کی ہیں۔ اس کا الہامی مذہب سے بنیادی فرق یہ ہے کہ الہامی مذاہب میں ہدایت کا منبع وحی ہے، جب کہ جدیدیت میں ہدایت کا منبع انسانی عقل ہے۔

۲۰۴۔ روایات کے معاملے میں ایک الجھن تقویم کی بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عرب میں اور بقیہ دنیا میں مختلف تقویمیں رائج تھیں اور مختلف روایات میں مختلف تقویموں کے لحاظ سے واقعہ بیان کیا جاتا تھا۔ عرب میں خاص طور پر حرمت کے مہینوں کے حوالے سے بڑا ردوبدل ہوتا تھا۔ قریش اپنی سیادت کی وجہ سے بعض دفعہ حرمت کے مہینوں کے دنوں کو گھٹا بڑھا لیتے تھے اور بعض دفعہ انہیں آگے پیچھے کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے بعض دفعہ روایات کا وقت معلوم کرنے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے بارے میں عیسوی کیلنڈر میں مختلف تواریخ بیان کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ حضرات نے جن میں ترکی کے محمود پاشا فلکی، جرمن مستشرق اوسٹفلڈ اور مغربی مستشرق زمباور کا نام مشہور ہے، نے مختلف تقویموں کو مرتب کیا ہے۔ تمام تقویموں کو مربوط کرنے کی ضرورت ہے تاکہ روایات میں جو مسائل اس وجہ سے ہیں انہیں حل کیا جاسکے۔

۲۰۵۔ جدید طرز تحقیق میں معروضیت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ معروضیت سے کما حقہ خود سیکولر نقطہ نظر بھی بہرہ ور نہیں ہوسکا۔ اس معروضیت کے ضمن میں اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ درود نہ لکھیں تو یہاں جدید طرز تحقیق کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اس نوعیت کی باتوں سے صرف اس لئے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی ذہنوں کا مطالبہ ہے۔ یہ ذہن ایسا کرنے پر بھی کچھ نہیں مانیں گے۔ ان کے لئے لکم دینکم ولی دین کے کلیے پر ہی عمل کیا جائے گا۔

۲۰۶۔ مشکل القرآن پر برصغیر کے ایک عالم مولانا انور شاہ کشمیری کی بھی کتاب موجود ہے۔